قومی انقلابی پارٹی

کانگریس کی دستاویزات

منعقدہ ۱۰ تا ۱۳/اپریل

۱۹۸۹ء

• ناشر : قومی انقلابی پارٹی پبلیکشنز، کراچی

• مطبع : افریشیا پرنٹنگ پریس۔ ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی

• بار اوّل ۔ ۔ ۔ ۔ جولائی ۱۹۸۹ء

فہرست

باب سوم

پیش لفظ

قومی انقلابی پارٹی کی تیسری کانگریس تیرہ برس کے بعد ۱۰ تا ۱۴/اپریل ۱۹۸۹ء کو منعقد ہوئی جس میں ۳۰۰ سے زائد مندوبین اور دوست تنظیموں اور افراد نے بطور مبصر شرکت کی۔ پارٹی کی تیسری کانگریس کا انعقاد، پارٹی کے اندر ہونے والی زبردست نظری و تنظیمی جدوجہد کی مرہون منت ہے، جس کے لئے پارٹی کے مرکزی توسیعی اجلاس نے (جس نے مرکزی و صوبائی کمیٹیوں کے اراکین کی تین چوتھائی اکثریت نے شرکت کی تھی اور جسے پوری پارٹی کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی) پارٹی کے واحد حقیقی اور دستوری مرکز کے طور پر اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۵/مئی ۱۹۸۷ء میں کانگریس کے انعقاد کا اعلان کیا تھا اور مرکزی توسیعی اجلاس نے اپنے چوتھے اجلاس میں کانگریس کے انعقاد کا حتمی پروگرام دے کر اسے ٹھوس شکل دے دی تھی۔

پارٹی کی تیسری کانگریس میں پانچوں وحدتوں سے منتخبہ مندوبین، جو جمہوری طور پر منتخب ہو کر آئے تھے، نے جمہوری اور کھلے پن کے ماحول میں پوری دلجمعی سے شرکت کی۔ جس میں پارٹی رپورٹ اور مجوزہ پارٹی دستور پیش کیا گیا۔ باوجودیکہ دستاویزات خاصی ضخیم تھیں، مندوبین کی بڑی تعداد نے ان دستاویزات پر بحث مباحثے میں جاندار شرکت کی اور بہت سی ترامیم پیش کیں۔ پارٹی رپورٹ کے تمام حصوں پر اتفاق رائے سے ترامیم و اضافے قبول کر لیئے گئے جبکہ "انقلاب کا راستہ" کے باب چہارم پر کانگریس میں زبردست بحث مباحثے کے بعد مجوزہ ڈرافٹ اور کانگریس کی جانب سے تشکیل کردہ کمیٹی کے دو اراکین کی جانب سے پیش کی گئی ترامیم پر رائے شماری کروائی گئی۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہر دو مسودوں پر مساوی ووٹ پڑے اور بہت سے ساتھیوں نے اپنی رائے محفوظ رکھی، جس پر رپورٹ کے مجوزہ ڈرافٹ کے حق میں چیئر مین کے کاسٹنگ ووٹ سے اسے پاس کر دیا گیا۔ پارٹی دستور پر بحث مباحثہ بھی قابل

دید نی تھا، مندوبین ہر ہر شق پر اپنی رائے دے رہے تھے اور پارٹی کا نیا نام اور جھنڈا بھی مندوبین کی تجاویز پر اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

کانگریس نے قومی انقلابی پارٹی کو مزدور طبقے اور محنت کش عوام کی حقیقی، جاندار اور تخلیقی جماعت کے طور پر منظم کرنے، اور ملک کے مخصوص سماجی و معاشی، ثقافتی و روحانی، تاریخی و جغرافیائی حالات اور عوام کی جمہوری و طبقاتی قدروں اور مزاج کے مطابق ڈھالنے اور پارٹی کو قانونی کھلے حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے برسرعام لانے کے لئے مرکزی کمیٹی کو اختیار دیا کہ وہ کانگریس کے فیصلے کے مطابق ضروری اقدامات کرے گی۔ کانگریس نے سامراج مخالف "متحدہ پارٹی" کے موجودہ حالات میں کردار کو سراہتے ہوئے یہ رائے بھی قائم کی کہ اس کے سامراج مخالف اور بااصول جمہوری موقف کو مضبوط کیا جائے گا، بشرطیکہ وہ اس موقف سے روگردانی نہ کرے۔ یوں پارٹی کو کھلا کرنے کا اہم فیصلہ، متحدہ پارٹی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تھا۔

پارٹی کی تیسری کانگریس نے ملک بھر کی تمام برادر مارکسی تنظیموں کے مابین نظری و تنظیمی ایکتا کے لئے "اتحاد کانگریس" کی اپیل متفقہ طور پر منظور کی۔ عقیدہ پرستی، بائیں بازو کی تنگ نظری دم چھلا پن اور گروہ بندی کے رجحانات کو رد کرتے ہوئے سائنسی سوشلزم کے اپنی ٹھوس حقیقتوں کے مطابق تخلیقی اطلاق کی داغ بیل ڈالی۔ کانگریس نے تنظیمی و نظری معاملات میں اسٹالنسٹ نوکر شاہی و آمرانہ طرز عمل اور خطوط کی بھی نفی کی اور پارٹی کو جمہوری خطوط پر منظم کرتے ہوئے نئی مرکزی کمیٹی کا انتخاب کیا۔ کانگریس کے آغاز کی طرح، کانگریس کا اختتام بھی مزدور طبقے کے عالمی ترانے پر ہوا۔

ابتدائیہ

پارٹی کی تیسری کانگریس عالمی انقلابی عمل کے ایک انتہائی اہم موڑ اور پاکستان کی سماجی و سیاسی صورت حال کے ایک اہم دور میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانگریس کے سامنے پارٹی کی چالیس سالہ جدوجہد کے نتائج اور اسباق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک کی انقلابی تحریک کو درپیش ایسے نظریاتی مسائل کا حل دریافت کرنا ہے جو تحریک کو طویل عرصہ سے درپیش ہیں اور جو گذشتہ دو سال میں زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان مسائل کی سائنسی بنیادوں پر چھان پھٹک کیلئے یقیناً زیادہ وقت درکار ہے تاہم اس مرحلے پر ان سوالوں کا تعین اور ان کے حل کیلئے ذمہ دارانہ رویہ اپنانے اور ایسی بنیادیں استوار کرنے سے جن سے ہم موضوع کو معروض سے ہم آہنگ کرسکیں ہم تحریک کی کجرویوں کو دور کرنے کی سمت مثبت قدم اٹھا سکیں گے۔ اگرچہ ملک کی سماجی ساخت سے متعلق مسائل پر ایک مسودہ تیار کیا جا چکا ہے جس پر ساتھی بحث و مباحثہ کر رہے ہیں، لیکن سماجی ساخت کا تعین تحریک کو درپیش ہر سوال کا جواب نہیں ہے۔ یہ یقیناً مسائل کے حل کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو برس کے دوران پارٹی میں رسمی و غیر رسمی مباحثوں کے نتیجے میں بہت سے امور پر ہم آہنگی پیدا ہوئی ہے۔

آج کے دور کی اہم خصوصیت انتہائی متضاد اور پیچیدہ تر جدید عناصر کی باہمی تال میل اور کشمکش ہے جو مقداری و صفتی اعتبار سے اسقدر متنوع ہو گیا ہے کہ موجودہ دنیا اور حالات کا واضح ادراک کئے بغیر عالمی انقلابی عمل کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور نہ ہی موجودہ تاریخی دور کے عظیم فریضوں کی تکمیل کی سمت ایک قدم آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس لئے آج کے دور میں انقلابی تحریکوں کا فریضہ ہے کہ حقیقت پسندانہ، معروضی اور انقلابی راہ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں، مزدور طبقے اور عوام کی قوتوں اور استعداد کو

تخلیقی طور پر لوچدار طریقہ کار، جرأت مندانہ پہل قدمی اور مستقل مزاجی سے بھرپور طریقے سے متحرک منظم اور فعال بنائیں۔ انہیں جدید دور کی تیز رفتاری سے ہم آہنگ کریں۔ پارٹی نے واضح طور پر اس دور کی نفی کر دی ہے جب عقیدہ پرستی، گھڑے گھڑائے فارمولوں، واقعات اور افواہوں پر مبنی پالیسیوں، عملیت پسندی اور موضوعی فکر کو انقلابی سیاست کی بنیاد بنا دیا گیا تھا۔

مارکس اور اینگلز نے درست طور پر "فارمولوں کو رٹنے اور دھرانے کا مذاق اڑایا تھا"، "جو زیادہ سے زیادہ عمومی فریضوں کی نشاندھی کر سکتے ہیں اور لازماً تاریخی عمل کے مخصوص دور کے ٹھوس معاشی و سیاسی حالات کے تحت تبدیلی کے قابل ہوتے ہیں۔"

لینن نے پرولتاریہ کی پارٹی کی سنجیدگی کا پیمانہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کسی سیاسی پارٹی کا اپنی غلطیوں کی طرف رویہ اس بات کا اندازہ لگانے کا ایک انتہائی اہم اور معتبر معیار ہے کہ پارٹی کتنی سنجیدہ ہے۔ اور وہ اپنے طبقے اور محنت کش عوام کے لئے اپنے ذمہ داری کو عملی طور پر کیسے پوری کرتی ہے۔ غلطی کو اعلانیہ تسلیم کرنا، اسکے اسباب معلوم کرنا، اس صورت حال کا تجزیہ کرنا جسکا یہ نتیجہ ہو اور غلطی کو ٹھیک کرکے طریقوں پر توجہ کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا، یہ ہے سنجیدہ پارٹی کی علامت۔ یہ ہے اسکی ذمہ داری کی تکمیل، یہ ہے طبقہ کی اور پھر عوام کی تربیت و تعلیم۔ لیکن محض ماضی کی نفی کرنے سے ناکامیوں اور کمزوریوں کا بوجھ دوسروں پر ڈالنے سے پرولتاریہ کی انقلابی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بلکہ منفی رجحانات کی نفی کرنے اور مثبت رجحانات کو بڑھاوا دینا ہی انقلابی تنظیم کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

محنت کش طبقے اور سارے عوام کی جانب سے پارٹی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ موجودہ تاریخی دور اور اس کے عبوری مراحل کا تعین کرے۔ حکمت عملی اور راہ عمل کا ٹھوس حقیقت پسندانہ اور ہمہ گیر خاکہ تیار کرنے اور اس کے حصول کیلئے ان تمام امکانات جو اندرونی و بیرونی عناصر کے تال میل سے یا حکمران طبقوں کی ناعاقبت اندیشی کے باعث وقوع پذیر ہوسکتے ہیں، کا احاطہ کرتے ہوئے لوچدار تدبیری لائحہ عمل مرتب کرے۔ جو بدلتے ہوئے حالات اور جدوجہد کی صورتوں کا احاطہ کرے۔

باب اوّل

عالمی صورتحال

ہماری پارٹی کانگریس بیسویں صدی کی نویں دہائی میں تاریخ کے ایک ایسے نازک اور فیصلہ کن موڑ پر منعقد ہو رہی ہے جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب نے پیداواری قوتوں اور قدرت کو تسخیر کرنے والے ذرائع کو زبردست مہمیز لگائی ہے اور انسانی ترقی میں نئے افقوں کو روشن کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایٹمی اسلحے اور دیگر تباہ کن ہتھیاروں کی دوڑ ایسے نازک مرحلہ پر پہنچی ہے جس نے کرہ ارض، انسانی زندگی اور تمام انسانی تہذیب و تمدن کو نیست و نابود ہونے کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ ایٹم بم کی ایجاد سے "اسٹار وار" پروگرام، تھرمو نیوکلیئر، ہائیڈروجن، لیزر، کیمیائی، بیکٹیریل اور دوسرے وسیع تباہی کے اسلحوں تک کی بھرمار کی بنیادی ذمہ داری دنیا پر بلا شرکت غلبہ پانے اور استحصال کرنے کی جنونی سامراجی پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔

سوویت یونین، جس نے فاشسٹ جارحیت کے خلاف انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مزاحمتی جنگ لڑ کر ساری دنیا کو فاشسٹ غلبے سے بچانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اس صدی کے آٹھویں عشرے کے لگ بھگ فوجی طاقت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ ایک عمومی توازن پیدا کرنے میں کامیاب ہوا اور ایک بار پھر تاریخی تبدیلیوں کی راہ کھولنے اور امن کی جدوجہد کے لئے ایک نئی بنیاد فراہم کرنے کا نقیب ثابت ہوا۔ لیکن ایٹمی اسلحے اور دوسرے تباہ کن اسلحوں کے انباروں کی موجودگی میں سامراجی صنعتی فوجی کمپلیکس کی ناپاک ریشہ دوانیوں اور سماجی انتقام کی پالیسیوں کے

باعث دنیا ایٹمی قیامت کے خطرے کی طرف لڑھکتی گئی جس کی طرف درست رویہ اختیار کرنا سماجی اور سیاسی تحریکوں کے تاریخی رول کی افادیت کے لیے معیار بن چکا ہے اور کرہ ارض اور انسانیت کی بقا کا سوال، آج تمام خطہ ارض کے انسانوں کے لیے ہر طرح کی تفریق و تقسیم سے قطع نظر، عالمگیر اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ کرہ ارض اور نسل انسانی کی بقاء کی ذمہ داری آج فقط عالمی امن تحریک اور سوشلسٹ ممالک کی ذمہ داری نہیں رہی بلکہ عالمی سرمایہ داری اور دنیا کے تمام ممالک کی مشترکہ ذمہ داری بن گئی ہے۔

مختلف سماجی و سیاسی نظاموں، مختلف براعظموں، مختلف قوموں، نسلوں اور مختلف ممالک میں رہنے والے کروڑوں انسانوں نے جس طرح عالمی امن کے تحفظ کی تحریک میں سرگرمی اور مستقل مزاجی سے حصہ لیا ہے اس سے بلند ہوتے ہوئے انسانی شعور کی ایک نئی سطح کی نمائندگی ہوتی ہے۔ کرہ ارض اور مشترکہ انسانی تہذیبی ورثے کو ایٹمی تباہی سے بچانے کا فریضہ تمام امن پسند اور ترقی پسند انسانیت کا تاریخی فریضہ بن گیا ہے۔ آج کی دنیا میں تمام سماجی اور سیاسی تحریکوں کو اسی تناظر میں دیکھنا ہو گا اور مزدور طبقے کا عالمی تاریخی مشن اور اس کی انقلابی طبقاتی جدوجہد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں مختلف سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظاموں کے درمیان پر امن بقائے باہمی نے ایک نئی اہمیت اور ایک نیا مفہوم حاصل کر لیا ہے اور عالمی امن کا تحفظ مزدور طبقے کے عالمی تاریخی مشن کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ امن اور جنگ کے سوال کی زبردست اہمیت کے علاوہ بیسویں صدی میں انسانی معاشرے میں اور بہت ساری تاریخی اہمیت رکھنے والی دور رس تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جس سے نتائج نکالے بغیر مزدور طبقے کی تحریک اپنے اہداف، سٹریٹیجی اور حربوں کے بارے میں اپنے فریضوں سے انصاف نہیں کر سکتی۔

سائینٹفک اور ٹیکنالوجیکل انقلاب سے جو زبردست اقتصادی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں وجود میں آئی ہیں ان کا ہر پہلو سے سمجھنا نہ صرف ایک تاریخی ضرورت ہے بلکہ روزمرہ کے عملی فرائض کی انجام دہی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مواصلات، مائیکرو الیکٹرونکس، بائیو ٹیکنالوجی اور سائنس و ٹیکنالوجی کی بہت ساری دیگر شاخوں میں حیرت انگیز ترقی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی خود کاری، AUTOMATIZATION اور کمپیوٹرائزیشن سے نہ صرف پیداواری قوتوں کو حیرت ناک مہمیز لگی بلکہ اس سے خود سرمایہ دارانہ سماجی ڈھانچے اور مزدور طبقے کی ساخت، حیثیت اور روش میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے کمیونسٹ اور مزدور طبقے کی تحریک کے لیے خود

کو نئی صورتحال کے مطابق ڈھالنا ضروری ہو گیا ہے۔

سائینٹفک تکنیکی انقلاب سے پیداواری قوتوں کی زیادہ سے زیادہ بین الاقوامی ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ پیداواری قوتوں کے روز افزوں طور پر بڑھتے ہوئے بین الاقوامی کردار کی حقیقت سے عملی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے نتائج اخذ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس پس منظر میں ہی مختلف اقتصادی، سماجی اور ثقافتی رشتوں اور تعاون کی ضرورت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب نے پوری دنیا میں کیفیتی اعتبار سے ایک نئے دور کی شروعات کی ہیں جو بیک وقت عالمی سرمایہ داری، عالمی اشتراکیت اور تیسری دنیا کے ممالک کی سماجی نشوونما اور سماجی تعلقات کو گہرے طور پر متاثر کر رہا ہے اور عالمی سرمایہ داری و عالمی اشتراکیت کے درمیان تعلقات کے خطوط اور ان سے متعلق بہت سے بے لوچ تصورات کو بدل رہا ہے۔ ایک طرف عالمی سرمایہ داری میں سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب نے ایک نئی روح پھونکی ہے وہاں پیداواری قوتوں میں یہ عظیم انقلاب پیداواری رشتوں اور پورے سماجی ڈھانچے میں اتھل پتھل کا باعث ہے اور عالمی سرمایہ داری کے اندر نئے تضادات اور بحران کی قطعی مختلف صورتوں کو جنم دینے کا باعث بن رہا ہے۔ خاص طور پر پیداوار اور سرمائے کے زیادہ سے زیادہ عالمی کردار اور سماجی طور پر نہایت طاقتور حیثیت کے حامل ہو جانے کے نتیجے میں سرمایہ دار دنیا میں طبقاتی تضادات و سماجی کشمکش نے ماضی سے ہٹ کر نئی نہج لی ہے۔ اسی طرح عالمی اشتراکیت، جو پسماندہ ملکوں میں بپا ہونے کے باوجود عظیم تاریخی کامیابیوں کی مرہون منت ہوئی، اب اسے جدید سائنس و ٹیکنالوجی کو جمود کا شکار بہت سے معاشی ڈھانچوں اور طرز ہائے تنظیم کو بدل کر پیداوار میں سرعت سے استعمال میں لانا ہوگا۔

نتیجتاً ہر دو سطحوں پر تبدیلیاں دونوں عالمی نظاموں کے درمیان عالمی سطح پر زیادہ فعال دو دو طرفہ اور منفعت بخش تعاون کی متقاضی ہیں۔

چنانچہ اس صدی کی نویں دہائی کے آخری وسط میں بین الاقوامی تعلقات میں نئے اور مثبت رویے سامنے آئے ہیں۔ عسکریت اگرچہ اب بھی معاشی و سیاسی عمل میں انتہائی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ لیکن سائنسی و تکنیکی انقلاب کے باوصف اب فوجی گھیراؤ، فوجی اڈوں کے قیام اور عسکریت کی دیگر شکلیں ازکار رفتہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی اثنا میں بہت سارے عالمی مسائل ابھرے ہیں جن کو پوری عالمی برادری کی مشترکہ کوششوں ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

کرہ ارض کے ماحول کو آلودگی سے بچانے کا مسئلہ اس سلسلے میں سرفہرست ہے

جس سے کوئی ایک ملک یا معاشرتی نظام اپنے طور پر نہیں نمٹ سکتا۔ اس سلسلے میں مختلف ممالک اور تنظیموں کے درمیان تعاون اور اشتراک کے ثمر بخش نتائج پہلے ہی سامنے آچکے ہیں۔ لیکن یہ ماحول کو آلودگی سے بچانے کی جدوجہد کو مربوط نظام بنانے کی کوششوں کا صرف آغاز ہے۔ اس کے علاوہ قحط، زلزلوں اور دوسری قدرتی آفات سے پیدا ہونے والی تباہی کا مقابلہ بھی مختلف ملکوں، سماجی اور سیاسی نظاموں کی مشترکہ کوششوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سمندر، خلاء اور کائنات میں موثر تحقیق و جستجو بھی اکیلے کسی ایک ملک یا نظام کے بس کی بات نہیں رہی، اس سلسلے میں وسائل و علم کو جمع کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک پر بڑھتے ہوئے بیرونی قرضوں کا بوجھ نہ صرف ان ممالک کے عوام کی معاشی زندگی کے لیے ایک روگ بن گیا ہے۔ بلکہ آخری نتیجے میں یہ امن و سلامتی کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔ اس لیے ان قرضوں کے بوجھ سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کو چھٹکارا اور ایک نئے منصفانہ معاشی نظام کو وجود میں لانے کے لیے بھی سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے، جس کے نتیجے میں تیسری دنیا کے معاشرے بھی انسانی ترقی کی دوڑ میں شریک ہو سکیں اور سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ان اور بہت سارے دیگر عوامل کے پیش نظر بین الاقوامی تعلقات میں سدھار کے لیے نئی "سیاسی سوچ" وجودِ عمل آتی ہے۔ یہ امن و ترقی کے لیے جدوجہد کرنے والی قوتوں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ نئی سیاسی سوچ ایٹمی تباہی کے خطرے کے دور میں، سائنسی و تکنیکی انقلاب کے دور میں پیداواری قوتوں کے روز افزوں طور بین الاقوامی ہونے کے دور میں اور پیچیدہ عالمی مسائل کو ایک نیا طرز اور نئی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس کا زور دنیا کو ایٹمی اور دوسرے خطرناک اسلحوں سے پاک کرنے، علاقائی تنازعوں کو پر امن مذاکرات کے ذریعے حقیقت پسندانہ اور دو طرفہ مفاد کے اصول پر حل کرنے اور عالمی مسائل کو حل کرنے اور انسانی ترقی کے لیے پر امن تعاون بڑھانے پر ہے۔ چونکہ آج کی دنیا باہم طور پر انحصار کرتی ہے اور گہرے طور پر ایک دوسرے کو متاثر و متعلق کرتی ہے۔ لہٰذا یہ سیاسی سوچ سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظاموں کے درمیان تاریخی مقابلے کی پر امن شکل پر انحصار کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایٹمی تباہی کے خطرے کے پیش نظر جنگ کے ذریعے مسائل کے حل کی کوششوں کو قطعی طور پر رد کرتی ہے۔ ویسے تو نئی سوچ مجموعی طور پر امن اور ترقی کی قوتوں کی مشترکہ جدوجہد اور سعی کا حاصل ہے۔ لیکن اس کو فارمولیٹ کرنے میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی آف

سوویت یونین کی ستائیس ویں کانگریس اور انیسویں کانفرنس کے تجربوں اور فیصلوں کی تاریخی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے جنرل سیکریٹری کامریڈ میخائیل گورباچوف کی متحرک پہل کاری، تخلیقی اور چاک و چوبند قیادت نے سوویت امن پالیسی میں ایک نیا تحرک پیدا کر دیا ہے جس سے عالمی امن تحریک مضبوط ہوئی ہے اور ایک نئی سرد جنگ شروع کرنے کے لیے عالمی سامراج کے رجعت پسند حلقوں کی کوششوں کو دھچکا لگا ہے۔ سوویت قیادت کی پے درپے اور توانا پہل کاریوں اور عالمی امن تحریک کی تاریخ ساز جدوجہد نے یورپ سے وسطی فاصلے تک مار کرنے والے میزائیلوں کے ہٹائے جانے کو ممکن بنایا ہے اور اسٹریٹیجک اسلحوں کو پچاس فی صد گھٹانے اور کیمیائی اسلحہ کو ختم کرنے اور یورپ میں روایتی اسلحوں اور افواج میں یک طرفہ کمی کے اہم اقدامات سے، تخفیف اسلحہ اور بالخصوص ایٹمی اسلحہ کے خاتمے کی جانب اہم پیش رفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ علاقائی مسائل کو پر امن مذاکرات کے ذریعے سیاسی طور پر حل کرنے کی کوششوں کو جن کا آغاز افغانستان کے بارے میں گذشتہ سال اپریل کے مہینے میں جینیوا معاہدے سے ہوا، بڑھاوا ملا ہے۔ مرکزی امریکہ میں کشمکش اس کے باوجود کم ہوئی ہے کہ امریکی سامراج کے رجعت پسند حلقے انقلابی نکاراگوا کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور انقلابی گریناڈا کے انقلاب کا گلا گھونٹنے میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن علاقہ کے تمام ملکوں اور عوامی تحریکوں نے مستقل مزاجی کے ساتھ کشمکش کم کرنے کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ انگولا اور جنوبی افریقہ کے درمیان ہونے والے معاہدے نے دنیا کے اس خطے میں پر امن تعلقات استوار کرنے کے امکانات کو روشن کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جہاں تباہ کن ایران، عراق جنگ کا خاتمہ ہوا ہے۔ وہاں فلسطینی عوام کی دلیرانہ جدوجہد نے آزادی حاصل کرنے کی کوششوں کو ایک نئے مرحلے میں داخل کیا ہے۔ بہادر اور باشعور فلسطینی عوام کے آزادی کے لیے مستقل مزاجی سے جاری رہنے والے طویل اور تاریخ ساز ابھار "انتفادہ" نے قومی آزادی کی جدوجہد کی نئی راہیں روشن کی ہیں اور سامراجی اور صیہونی طاقتوں کے وحشیانہ اور ظالمانہ جبر و تشدد کے باوجود اولوالعزمی اور پامردی کے ساتھ کی جانے والی قومی آزادی کی منصفانہ جدوجہد کے ناقابل تسخیر ہونے کو ثابت کر دیا ہے اور مشرق وسطیٰ کے مسائل کے جامع حل کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس بلانے کے مطالبے کو اتنی وسیع حمایت حاصل ہوئی ہے کہ اب زیادہ دیر تک اس کے انعقاد کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

ہم نئی سیاسی سوچ کی بنیاد پر امن، جمہوریت اور ترقی کے حق میں تبدیل ہونے

والی ایک نئی سیاسی فضاء کی بات کر سکتے ہیں۔ یہ نئی سیاسی فضاء دیتانت کے ایک اور دور کی شروعات کی خوش خبری دیتی ہے جو دو نظاموں کے درمیان تصادم کے بجائے باہم انحصاری اور عالمی سطح پر دو طرفہ و یکساں مفادات کی بنیاد پر تعاون پر زور دیتی ہے۔ یہ مزدور طبقے کو دنیا کی انقلابی تبدیلی اور ترقی اور محکوم قوموں کی آزادی کی جدوجہد کی تنظیم کے لیے نئے مساعد حالات پیدا کر رہی ہے۔ البتہ آج کی پیچیدہ اور متنوع دنیا میں سیاسی سوچ کی انطباقی اشکال کے بارے میں بحث جاری ہے اور اس کی تفصیلات کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً تیسری دنیا کے حالات میں اس کے بارے میں بہت سارے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

ہمارے خیال میں تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں جو سامراجی غلبے اور جدید نو آبادیاتی دوہرے استحصال کی لپیٹ میں ہیں عالمی سرمایہ داری نت نئے بحرانوں اور کشمکشوں کو جنم دے رہی ہے اور مظلوم اقوام کی سامراج مخالف جدوجہد سامراج سے مکمل نجات اور نئے عالمی معاشی نظام اور رشتوں کی راہ ہموار کرے گی۔ یہ جدوجہد نسبتاً اگر فیصلہ کن طور پر نہیں تو موثر طور پر عالمی سرمایہ داری نظام کو بھی متاثر کر رہی ہے اور اس کے POTENTIAL کو کم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جہاں تک علاقائی تضادات کو حل کرنے کے سوویت پہل کاریوں کا تعلق ہے وہ یقیناً نہ صرف امن بلکہ مختلف علاقوں کے عوام کے مفاد میں ہے۔ لیکن سامراجی و دیگر رجعت پسند قوتیں، اپنی مداخلت کاری، لوٹ کھسوٹ اور غلبہ حاصل کرنے کی روش کو ترک کرنے کو بظاہر تیار نظر نہیں آتیں۔ مثلاً افغانستان میں عالمی سامراج اور علاقائی رجعت پسندوں اور پاکستان کے عسکریت پسند بنیاد پرست و آمرانہ حلقوں کی جانب سے، جینیوا معاہدے کے برعکس افغانستان کے اندرونی معاملات میں پہلے سے بڑھتی ہوئی فوجی مداخلت کاری اور فوجی مہم جوئی جاری رکھنے کے باوجود سوویت یونین کی جانب سے جینیوا معاہدے پر یک طرفہ و سرعت سے عمل درآمد جہاں سوویت امن پسندی کو ظاہر کرتا ہے، وہاں سامراجی و رجعتی قوتیں اسے سوویت "کمزوری" سے تعبیر کرتے ہوئے زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اس اعتبار سے اس پالیسی پر عمل درآمد سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد افغان پارٹی اور انقلاب و جمہوری قوتوں نے خود انحصاری کرتے ہوئے سامراجی و رجعتی قوتوں کی فوجی محاذ آرائی کو دندان شکن جواب دیا ہے اور فوجی حل کے جواب میں سیاسی حل کے امکانات بڑھائے ہیں اور اس میں افغان سوویت معاہدہ کے مطابق سوویت امداد یقیناً قابل ستائش ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ بہت ساری تاریخی، سماجی و ثقافتی وجوہات کی بنا پر امن کی

تحریک تیسری دنیا کے ممالک بالخصوص ایشیائی ممالک میں اتنی مضبوط نہیں بن سکی ہے جیساکہ آج کے دور کی تاریخی ضرورت ہے۔ مزدور طبقے کی انقلابی تحریک کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں عالمی امن کے تحفظ کی ضرورت کو معاشرے میں مسائل سے جوڑ کر اور اپنے عوام کے فہم اور ادارک کی سطح اور کلچر کے مطابق پیش کرنے کی ضرورت پر جتنازور دیاجائے وہ زیادہ نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی نشاندہی کی جانی چاہیے کہ امریکی سامراج اور عالمی سامراج کا صنعتی فوجی کمپلیکس ابھی تک دنیامیں پیدا ہونے والی نئی سیاسی فضا کو پوری طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ خصوصاً جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس سے سامراجی فوجی صنعت کو کتنی زک پہنچتی ہے۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے بحران سے نمٹنے کے لیے دائیں بازو کی نئی قدامت پسندی کی لہر عالمی حالات میں امن کے تحفظ کے لیے امکانات کے بھرپور استعمال کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

سامراجی سیاست دنیا پر اپنی استحصالی بالادستی قائم رکھنے، سوشلزم کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب کے ثمرات کو پرامن ترقی کے لیے استعمال کرنے سے روکنے کے لیے اور جدید نو آبادیاتی نظام کو زبردستی بچانے کی کوششوں میں کمیونزم دشمنی اور سوویت دشمنی کے ہتھیاروں کو اب تک استعمال کر رہی ہے۔ بہت سے سامراجی ملکوں خصوصاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حکمران طبقے ماضی کو برقرار رکھنے اور دوبارہ زندہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایسی صورت حال میں عالمی امن کے تحفظ کے لیے کوششوں اور جدوجہد کرنے والی قوتوں کی جدوجہد کو اور تیز کرنے اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ امن اور دیتانت کا تاریخی سلسلۂ عمل ان رکاوٹوں پر خود بخود قابو نہیں پاسکتااور اس سلسلے میں اگر غفلت کی گئی تو وہ ساری دنیا کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

نئی عالمی صورت حال اور نئے اقتصادی، سماجی، سائنسی تکنیکی اور ثقافتی عوامل کی وجہ سے نہ صرف بین الاقوامی تعلقات بلکہ معاشرے کی ہر سرگرمی میں نئے انداز اور رویے اپنانے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اس ضرورت کا ادراک بہت زیادہ شدت کے ساتھ سوشلسٹ ممالک کو ہوا ہے۔ سوشلسٹ ممالک میں جس مہم کاآغاز اقتصادیات میں تعمیق INTENSIFICATION کے مطالبے سے ہوا تھااسی نے آہستہ آہستہ سیاسی نظام، ریاستی ڈھانچے نظریے اور کلچر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور یہ اب مکمل تعمیر نو یاپری سٹرائیکا کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

پری سٹرائیکا عالمی کمیونسٹ تحریک میں، عقیدہ پرستی، گھڑے گھڑائے

فارمولوں اور بے لوچ طرز فکر کو رد کرکے، نئے معروضی تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات میں مارکس ازم کے تخلیقی رجحان کی غماز ہے۔ حالانکہ ابھی نئے مسائل و سوالات پر نئے انداز فکر کا آغاز ہوا ہے لیکن ابھی ان مسئلوں کا سائنسی و تخلیقی حل تلاش کیا جانا باقی ہے۔ عالمی تعلقات میں دنیا کی نئی صورت حال اور مختلف قوتوں کے جائزہ پر مشتمل نئی سوچ نے عالمی سطح پر مسائل و تضادات کو حل کرنے میں اپنی فعالیت ثابت کرنا شروع کردی ہے۔ اس نے نظریاتی اعتبار سے کمیونسٹ تحریک میں عقیدہ پرستی، جامد و ساکت فارمولوں اور گھسے پٹے نوکرشاہی طرز عمل کی نفی اور تخلیقی و جاندار فکر و عمل کو مہمیز لگائی ہے اور سوشلسٹ ملکوں میں اسٹالنسٹ تنظیم کمانڈ سسٹم اور سیاسی زندگی میں عوام سے بیگانہ نوکرشاہی اور بعض صورتوں میں آمرانہ ڈھانچوں اور طرز عمل و فکر کو تنسیخ کرنے کے جس مجموعہ عمل اور کھلے پن OPENNESS کے سلسلے کا آغاز کیا ہے وہ سماجی جمہوریت کے ساتھ ساتھ سیاسی جمہوریت کے فروغ کا باعث بن رہا ہے جو عوام الناس کے جمود و بیگانگی کو ختم کررہا ہے اور ان میں تخلیقی تحرک اور جاندار شرکت بڑھا رہا ہے۔ جمہوریت کے بڑھنے کا عمل جتنا زیادہ کامیاب ہوگا اتنا ہی سوشلسٹ نظام کے حقیقی POTENTIAL اور عوام کی تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔ تعمیر نو کا عمل بھی اسی سے جڑا ہے۔ البتہ معاشی ڈھانچے میں لائی جانے والی تبدیلیوں جو کہ اپنی جگہ نہایت ضروری اور بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا اور یہ یقیناً سوشلسٹ تعمیر میں نئے تجربوں اور طریقہ ہائے کار کو متعارف کرائے گا۔

البتہ یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہیے کہ یہ تبدیلیاں ابھی عبوری مراحل میں ہیں ابھی بہت سارے سوالات اٹھائے گئے ہیں اور سب کے جوابات موجود نہیں ہیں۔ تعمیر نو اور تبدیلی کے نام پر کہی جانے والی ہر بات صحیح نہیں ہے اور یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ابھی بہت سارے تنقیدی جائزے لیے جانے ہیں اور بہت سارے تھیسس کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جانا ہے۔ اسی لیے جہاں ایک طرف زندگی کے ساتھ تبدیلیٔ عمل کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جانا چاہیے وہاں کسی بات کو حرف آخر نہیں بنانا چاہیے۔ پری سٹرائیکا ویسے تو کسی ایک ملک یا پارٹی تک محدود نہیں ہے لیکن اس ضمن میں سوویت پارٹی نے قابل تقلید پیش قدمی کی ہے۔ سوویت پارٹی اپنی ستائیس ویں کانگریس منعقدہ ۲۶ فروری ۱۹۸۶ء میں سوویت معاشرے کو مزید جمہوری بنانے عوامی سوشلسٹ سیلف گورنمنٹ کے فروغ، سوویت اقتصادیات میں انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کی اصلاحات کے دوررس فیصلے کیے ہیں۔ سوویت معاشرے میں انقلابی تعمیر نو کے لیے

ایک بھرپور مہم کا آغاز کیا ہے۔ جس کی وجہ سے سائنسی سوشلزم کی تخلیقی حیثیت کو عقیدہ پرستی کے خلاف جدوجہد کے ذریعے ترویج دینے کی سعی کی جا رہی ہے۔ سماج کو جمہوری بنانے کے عمل نے سماجی سرگرمی میں ایک نئی روح ڈال دی ہے۔ پارٹی، حکومت اور عوامی تنظیموں کی سرگرمی میں کھلے پن کی پالیسی نے تنقید اور خود تنقیدی کے ذریعے نہ صرف پارٹی کی بلکہ عوام الناس کو ماضی اور حال کی تفہیم، سماجی ترقی میں حامل عناصر کی شناخت اور سماجی عمل میں عوام کی تخلیقی شرکت کی راہیں کھول دی ہیں۔ خاص طور پر سوویت پارٹی نے پارٹی میں نوکر شاہی رویوں کے خاتمے کے لیے جو جہاد شروع کیا ہے وہ دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کی پارٹیوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ پارٹی کی تنظیم کے لیننی اصول جمہوری مرکزیت کے جدلیاتی توازن کو انتہائی باریکی سے برقرار رکھے بغیر ایک ترقی پذیر صحت مند اور تخلیق کار پارٹی کی تشکیل ممکن نہیں۔ اس اصول سے پہلو تہی پارٹی کی نشوونما اور خاص طور پر اس کی عوام کی رہنما قوت اور ترجمان پارٹی ہونے کی حیثیت کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ سوویت پارٹی کی کھلے پن کی پالیسی اور پری سٹرائیکا نے نظریاتی، سیاسی اور سماجی میدانوں میں اہم تبدیلیاں روشناس کرائی ہیں۔ عالمی کمیونسٹ تحریک ان پر تندہی سے بحث میں مصروف ہے اور ہم توقع کرتے ہیں کہ اس بحث و مباحثہ کے نتائج عالمی کمیونسٹ تحریک کی نشوونما میں اہم اثرات کے حامل ہوں گے۔

تعمیر نو کے بارے میں بحث و مباحثہ کے دوران یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی ہے کہ ہر پارٹی یا تحریک کو سائنسی نظریات کا تخلیقی اطلاق اپنے حالات کے مطابق کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں کسی ایک ماڈل کی نقل سے سختی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ آج کی دنیا جتنی متنوع اور متفرق ہے اور جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور جتنے متفرق اور مختلف اثرات دنیا پر مرتب ہو رہے ہیں ان کا عالمی کمیونسٹ تحریک پر اثر پڑنا اپنی جگہ لازم ہے۔ اس حقیقت کو ذرا بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کمیونسٹ تحریک اور اس کو درپیش فرائض و چیلنج نہایت متفرق ہیں۔ جو ظاہر ہے بہت سی صورتوں میں اختلاف اور متفرق رجحانات کو جنم دیتے ہیں۔ اسٹالنسٹ روایت میں جس طرح کمیونسٹ تحریک میں اتفاق و ایکا کو مطلق طور پر دیکھا اور پیش کیا جاتا رہا ہے اس کے عالمی کمیونسٹ تحریک پر مضر اثرات مرتب ہوئے حالانکہ تمام سوالات پر بلا استثناء اتفاق رائے پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ مختلف تاریخی ادوار اور بنیادی تقاضوں کے بارے میں کمیونسٹ تحریک میں جو اپنے اپنے قومی حالات میں قومی فرق کے ساتھ بڑھتی ہیں

کے یکساں رخ اور مشترک آدرش نے کمیونسٹ تحریک کو بالعموم متحد رکھا ہے۔ ہمیں اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ "ہم اپنی تحریک کی کثرت کو عدم اتحاد کے مترادف نہیں سمجھتے جس طرح کہ اتحاد کسی طور پر یکسانیت UNIFORMITY کے مترادف نہیں ہوتا۔ بالادستی، بعض پارٹیوں کی جانب سے دوسری پارٹیوں کے معاملات میں مداخلت، یا کسی پارٹی کی سچائی پر اجارہ داری کے لیے کوشش، کمیونسٹ تحریک میں پرولتاری بین الاقوامیت پر مبنی رفیقانہ تعلقات کی روح کے منافی ہیں۔ کمیونسٹ تحریک اپنی طبقاتی یکجہتی سے، مشترک مقاصد کے لیے، جدوجہد میں برادر پارٹیوں میں مساویانہ ورفیقانہ تعاون کے ناطے مضبوط ہو سکتی ہے اور اسے ہونا چاہیے۔"

پارٹی کے خیال میں بھی کمیونسٹ ایکتا کا مفہوم یہی ہے او وہ پرولتاری بین الاقوامی یک جہتی اور اپنے عالمی تعلقات کو انہی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے استوار کرے گی۔ عالمی انقلابی عمل کے فروغ اور سماجی ارتقاء میں سامراج مخالف انقلابات، قومی آزادی کی تحریکوں اور بڑی تعداد میں محکوم ممالک کی آزادی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ نو آزاد ممالک کے عوام سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اپنی پسماندگی، افلاس، غربت و جہالت اور مفلوک الحالی کے خاتمے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تاکہ عہد غلامی کی مسخ شدہ معیشت

اور سماجی ابتری سے نجات حاصل کر سکیں تاہم اس جدوجہد میں انہیں ایک طرف داخلی حکمران طبقوں کی رجعتی اور طفیلی پن کی پالیسیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو انہیں مستقل خارجی اور داخلی طور پر استحصال کے نظاموں سے منسلک رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بقا یقینی ہو سکے۔ تو دوسری طرف عالمی سامراج کی طرف سے سیاسی جوڑ توڑ، دھمکیوں، اور دھونس کے علاوہ بسا اوقات ان ممالک کے داخلی معاملات میں براہ راست مداخلت کے ذریعے اقتصادی محتاجی کو بدستور قائم رکھنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس کوشش میں عالمی سامراج ایک انتہائی جدید نو آبادیاتی استحصالی نظام قائم کرنے اور اسے اپنی عالمی حکمت عملی کے مفادات کے تحت چلانے میں کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ترقی پذیر قوموں کو انتہائی المناک زبوں حالی کا سامنا ہے۔ یہ زبوں حالی سامراج کی طرف سے ہتھیاروں کی دوڑ اور ترقی پذیر ممالک کو اشیا کے ضرورت کی بجائے مہلک ترین اسلحہ کا ذخیرہ بنانے کی وجہ سے مزید دو چند ہوئی ہے۔ سامراج نے اپنے اسلحہ جاتی کمپلیکس کے فروغ کے لیے ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں متعدد تنازعات اور منافشات کو ترویج دی ہے۔

بورژوا طبقہ آلات پیداوار میں اور ان کی وجہ سے تعلقات پیداوار میں اور ان کے ساتھ سماج کے سارے تعلقات میں لگا تار انقلابی الٹ پلٹ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

آج بھی عالمی سرمایہ داری میں ایک نئی الٹ پلٹ اور سرمایہ دارانہ سماجی تعلقات میں قطعی مختلف نوعیت کا خلل اور عدم استحکام پیدا ہو رہا ہے اور یہ سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب کے پیداواری قوتوں میں نئے انقلاب کے ناطے ہو رہا ہے۔ ذہنی اور جسمانی کام کرنے والوں اور براہ راست پیداوار کرنے والوں کی گذشتہ چار پانچ صدیوں کی تخلیق و پیداوار کے ثمر سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب میں اظہار پا کر سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کے مفاد میں اس طرح کام آ رہا ہے جس طرح "دوسروں کی محنت کی طرح دوسروں کی سائنس کو بھی سرمایہ اسی طرح قبضا رہا ہے۔" لہٰذا اس بڑی تبدیلی میں پیداوار اور دولت کا بنیادی مدعا نہ تو محنت کار کی کی ہوئی فوری محنت ہے اور نہ وہ وقت جس دوران وہ کام کرتا ہے بلکہ انسان کی عمومی پیداواری قوت کا انسان کے ہاتھوں استعمال ہے۔ نتیجتاً نہ صرف یہ پیداوار کے مساوی شعبوں پر غیر مادی شعبے حاوی ہوتے چلے گئے ہیں بلکہ براہ راست پیداوار کرنے والے خاص طور پر جسمانی محنت کرنے والوں کی بڑی تعداد، خودکاری، کمپیوٹرکاری اور بائیونائزیشن کے ہاتھوں براہ راست پیداوار کے عمل سے علیحدہ ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے پورے سرمایہ دارانہ طبقاتی ڈھانچے میں الٹ پلٹ اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی عالمی سرمایہ کے مفاد میں کام آ کر محنت کشوں کی بڑی تعداد کو پیداوار کے عمل سے علیحدہ کرتی جا رہی ہے۔ نتیجتاً بے روزگاری میں ماضی کے مقابلے میں اضافہ نہایت سرعت سے ہو رہا ہے۔

عالمی سرمایہ داری اور خاص طور پر اجارہ دارانہ سرمایہ داری کے بارے میں جو اندازے اس کے زوال اور ڈرامائی تباہی کے ناطے لگائے گئے تھے وہ کافی موضوعی تھے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب نے عالمی سرمایہ داری کو ایک نئی مہمیز لگائی ہے اور عالمی سطح پر سرمایہ کے اجتماع اور ارتکاز نے پہلے سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ سطح پر، عالمی اجارہ داریوں خاص طور پر ماورائے قومی کارپوریشنوں کو بڑھاوا دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ الیکٹرونک میڈیا اور جدید انفارمیشن سوسائٹی نے عالمی نشوونما کو دوچند کر دیا ہے۔ جدید سرمایہ داری کی اس زبردست نشوونما کے مضمرات عالمی سرمایہ داری کے مراکز پر مختلف طرح سے مرتب ہوئے ہیں۔ ایک طرف فوجی صنعتی کمپلیکس (MIC) اور اسلحہ کی جنونی دوڑ میں ملوث کثیر القومی کارپوریشنوں اور امریکی سامراج کی جارحانہ سامراجی آئیڈیالوجی کے زیر اثر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نہ صرف سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیق و ترقی کا رخ عسکری نوعیت کا رہا ہے۔ بلکہ پیداوار کے دیگر شعبوں میں عسکری پیداوار کے شعبے حاوی ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ پیداوار کے دیگر شعبوں میں پیچھے رہ گیا جبکہ جاپان جہاں عسکریت کا رجحان بہت دب گیا تھا، جدید صنعتی پیداوار کے

دیگر شعبوں میں بالخصوص اور اب مالیاتی سرمائے اور تجارت کے شعبوں میں بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح مغربی جرمنی باقی ماندہ یورپ کے مقابلے میں آگے بڑھ گیا ہے۔ اس سے سرمایہ داری کے تین مراکز میں ایک نئی کشمکش نے جنم لیا ہے۔ جس سے پرانی نوعیت کے رشتے اب قائم نہیں رکھے جاسکتے جس پر USA کو مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ عالمی سطح پر سرمائے کی اس عظیم الشان نشوونما جس میں چند ماورائے قومی کارپوریشنوں نے کلیدی کردار اختیار کر لیا ہے، کا براہ راست نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ اجارہ دار ریاستی سرمایہ دارانہ دور کی فوجی ریاست کا ڈھانچہ، مالی سرمائے اور خاص طور پر ماورائے قومی کارپوریشنوں کی ترقی کے سامنے رکاوٹ بنتا جارہا ہے اور اس کے ہاتھوں پامال ہو رہا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں ایک نئے بحران کو جنم دے رہا ہے۔

گو کہ، بعد از جنگ سالوں میں، عالمی سرمایہ داری کا دور جسے "گولڈن پیریڈ" قرار دیا جاتا تھا اب بدل گیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں دھائی کے مختصر عرصہ میں تین مرحلے آ چکے ہیں اور افراط زر نے ایک نئی جہت لی ہے اور یہ ایسے دھماکے کی صورت رونما ہونے لگے ہیں جیسے "کالے سوموار" کو ہوا جب وال اسٹریٹ کو یہ لگا کہ کیپیٹل مارکیٹ میں قیامت آگئی ہے۔

اس تمام بحران و بے یقینی کے باوجود عالمی سرمایہ داری میں ابھی بھی تیز نشوونما کی کافی زیادہ گنجائش ہے اور عالمی سرمایہ داری و سامراج دنیا میں اپنی حاوی پوزیشن کو برقرار رکھ سکیں گے۔ حالانکہ عالمی سرمایہ سرمایہ داری کے اندر ناہموار نشوونما اور تینوں مراکز کے درمیان نئی کشمکش سے عالمی سرمایہ داری کے مراکز کے تعلقات بڑی تبدیلیوں سے گزریں گے اور عالمی اشتراکیت سے اس کے تعلقات میں اہم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ باوجودیکہ عالمی سرمایہ داری میں عسکریت کا رجحان ہنوز بہت طاقتور ہے اور عالمی سامراج میں انتہائی دائیں بازو کی رجعت اور ان کے جارحانہ قدامت پسند حلقے ابھی بہت موثر ہیں۔ نشوونما کے نئے حالات میں غیر عسکری سرمایہ دارانہ نشوونما اور قوتوں کا طاقتور حیثیت اختیار کرنے کا عمل کافی موثر ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خود USA کو بھی عسکریت سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ بہ صورت دیگر عالمی سرمایہ داری میں یہ اپنا پرانا مقام کھو بیٹھے گا۔

آج کی عالمی نشونما میں کسی ملک اور نظام کے لیے اب مطلق علیحدگی میں رہ کر ترقی کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہ نشوونما عالمی انحصار اور زیادہ سے زیادہ معاشی و سائنسی و تکنیکی روابط اور تعلقات کی متقاضی ہے جو عالمی تعلقات میں نئے رجحانات اور نئی سوچ کو

مضبوط کرے گی۔

عالمی سرمایہ داری کی اس نئی سطح و نوعیت کے اثرات ترقی پذیر ممالک پر خصوصیت سے مرتب ہو رہے ہیں۔ ان ممالک کی داخلی صنعت ٹرانس نیشنل کارپوریشن کی یلغار کی زد پر ہے۔ جس سے ایک طرف مقامی سرمایہ دار طبقوں میں عالمی سرمایہ داری کے ساتھ شرکت، طفیلی سرمایہ داری کے فروغ کے رجحانات کو جنم دیا ہے تو دوسری طرف اس یلغار کی ضرب سے متاثر ہونے والے صنعتی سرمایہ کی سامراج دشمن صفوں میں شمولیت کی راہیں کھولی ہیں۔ تاہم طفیلی پن اور شراکت کا رجحان ہنوز غالب ہے۔ ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں کی اس یلغار نے ترقی پذیر ملکوں میں اقتصادی آزادی کے لیے جدوجہد کی مختلف شکلوں اور سطحوں کو بھی متاثر کیا ہے اور نئی صف بندیوں اور نئے پلیٹ فارموں کی تشکیل کی راہیں استوار کی ہیں۔ موجودہ عالمی اقتصادی تعلقات میں تبدیلی کے لیے نئے فورم بنے ہیں اور ایک نئے اقتصادی نظام کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ نئے اقتصادی نظام کے بارے میں کوئی واحد اور مکمل طور پر تعریف شدہ تصور موجود نہیں ہے لیکن عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی تیسری دنیا کے ممالک کی معاشیات پر گرفت کو گھٹانے، موجودہ قرضوں کے بوجھ سے نجات اور نئے قرضوں کی بہتر شرائط، عالمی تقسیم محنت میں نئے مقام، شرائط تجارت کے بدلنے، سائنس و ٹیکنالوجی سے بہرہ ور ہونے اور منصفانہ و مساوی بنیاد پر نئے عالمی اقتصادی نظام اور اقوام متحدہ کے عالمی معاشی تعلقات میں رول بڑھانے جیسے مسائل پر عام طور پر اتفاق پایا جاتا ہے۔

عالمی طور پر تدریجاً ابھرنے والی نئی سیاسی فضا کے اثرات براعظم ایشیا اور خود ہمارے خطے میں بھی محسوس کئے جا رہے ہیں گو کہ بحرِ ہند میں امریکہ اور ناٹو کے ملکوں کی فوجی موجودگی ڈیگو گارشیا کا سامراجی فوجی اڈہ اور جارحیت پسند امریکی سنٹرل کمانڈ موجود ہیں اور جاپان کو محور بنا کر سوویت یونین کے خلاف مشرقی ناٹو کے قیام کی کوششیں ترک نہیں کی گئیں لیکن کامریڈ گورباچوف کی ولاڈی واسٹک کی تقریر اور اس کے بعد مزید تجاویز، کمپوچیا کے سلسلے کے پر امن حل کے بڑھتے ہوئے امکانات چین اور سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے تعلقات میں سدھار، عراق اور ایران کے درمیان جنگ بند ہونے، افغانستان کے بارے میں جینیوا سمجھوتے پر دستخط ہونے اور افغانستان سے سوویت افواج کے انخلاء سے ایشیاء میں مختلف ممالک کے درمیان پر امن تعلقات کی کوششوں کو مدد ملی ہے اور کشمکش اور تنازعے پیدا کرنے کے سامراجی منصوبوں پر چوٹ پڑی ہے۔ ہماری پارٹی ایشیاء اور بحرالکاہل کے علاقے میں امن اور سلامتی کے استحکام اور علاقے کی ریاستوں کے مابین اس مسئلے پر افہام و تفہیم کے لیے کانفرنس کی تجویز کی

حمایت کرتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں منگولیا کی برادر پارٹی منگولین پیپلز انقلابی پارٹی کی پہل کاری پر پچھلے سال منعقد ہونے والی ایشیائی اور بحرالکاہل کے علاقے کی مزدور طبقے کی پارٹیوں کے مشاورتی اجلاس کے فیصلوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں اور اس پر عمل درآمد میں حصہ بٹانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ جینیوا سمجھوتے پر دستخط کے بعد افغانستان اور سوویت یونین کی طرف سے مکمل طور پر عمل درآمد سے اب تک افغان مسئلے کو حل ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن پاکستان کے حکمران حلقوں کے رجعتی ملٹرسٹ عناصر جو امریکی سی۔ آئی۔ اے اور پینٹاگون میں موجود اپنے سرپرستوں کی مدد سے تمام بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے افغانستان کو ایک اور لبنان میں بدلنا چاہتے ہیں۔ ان کی توسیع پسندی اور مہم جوئی پاکستان اور افغانستان کے درمیان مسلح تنازع کے امکانات کو جنم دیتی ہے۔ جو پاکستان اور افغانستان کے عوام پورے خطے اور عالمی امن کے مفاد کے خلاف ہے۔ پاکستان ایران اور افغانستان کو سوویت یونین اور دوسرے ہمسایہ ممالک کے خلاف ایک اسلامی فوجی بلاک میں جمع کرنے کی کوششیں سرد جنگ کے ماضی کے باقیات اور ان کے سامراجی آقاؤں کی فرسودہ اور ازکار رفتہ اسٹریٹیجی کا حصہ ہیں۔ اس اسٹریٹیجی کی شکست ایک حتمی امر ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں علاقے کے امن کے لیے اس کے خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اس لیے اس کے خلاف پوری شدت سے جدوجہد کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں پاکستان میں انقلابی جمہوری سامراج دشمن اور امن پسند قوتوں پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن کے ملک کو سامراجی طاقتیں علاقے میں اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے "فرنٹ لائین اسٹیٹ" قائم رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ امر بھی بہت تشویش ناک ہے کہ ایران میں عوامی جمہوری اور انقلابی عناصر کو بے رحمی سے کچلنے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ یہ بین الاقوامی طور پر ایران کو سامراجی فوجی اور سیاسی اسٹریٹیجی میں جوڑنے کی تیاری کا حصہ ہے۔ عالمی سیاست میں محاذ آرائی گھٹنے کے امکانات کے ساتھ ساتھ مشترکہ علاقائی، تاریخی، قومی اور تہذیبی بنیادوں پر مشترک جدوجہد کے نظریے اور عمل نے فروغ حاصل کیا ہے۔ غیر وابستہ تحریک جس نے سرد جنگ کے زمانے میں اہم رول ادا کیا تھا، موجودہ حالات میں بھی عالمی امن، قومی آزادی اور تیسری دنیا کے ممالک کے مفادات کے حصول میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اسلامی اتحاد کی تنظیم بھی اس دوران خاصی فعال ہوئی ہے۔ لیکن پیٹرو ڈالر کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کے باعث اس تنظیم کو مختلف مسائل پر سامراج کی عالمی اسٹریٹیجی کے لیے رجعت پسند عرب بادشاہتیں استعمال کر رہی ہیں۔ حالانکہ اس میں سامراج مخالف جدوجہد اور تیسری دنیا کے ممالک کے عوام کے مفادات کے حصول کی جدوجہد میں شریک ہونے کی

استعداد موجود ہے۔

دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح جنوبی ایشیاء میں بھی علاقائی تعاون کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ جنوبی ایشیاء کے ممالک کے تعاون کی تنظیم "سارک "SAARC" کے ادارے اس دوران میں مستحکم ہو رہے ہیں اور اس سے علاقے کے ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ سیاسی طور پر سارک کے رول کے بارے میں ابھی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ خصوصاً علاقے میں سامراجی ریشہ دوانیوں کو روکنے اور بحر ہند کے علاقے کو امن کا خطہ اور ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنانے کے بارے میں سارک کے ممالک کوئی مشترکہ پالیسی طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ہماری رائے میں جہاں مساوی بنیادوں پر مختلف ممالک کے مفادات اور اقتدار اعلیٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے علاقائی طور پر اقتصادی تعاون سب ملکوں کے عوام کے مفاد میں ہے وہاں معاشی اور سیاسی بالادستی کی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت ہونی چاہیے کیونکہ اس سے علاقے میں دیرپا دوستی اور تعاون کے کاز کو نقصان پہنچے گا۔ جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے مسئلے کا تعلق ہے، ہم دونوں ملکوں کے درمیان ایک دوسرے کے اقتدار اعلیٰ کے احترام اور مساوی بنیادوں پر اچھے پڑوسیوں کے تعلقات اور تجارتی اور ثقافتی تعلقات میں وسعت کی حمایت کرتے ہیں۔ ہماری پارٹی کی رائے میں دونوں ملکوں کے درمیان موجودہ اختلافات کو شملہ سمجھوتے کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے۔ اسلحہ کی دوڑ اور ایٹمی اسلحہ کی جانب خطرناک میلان کے خلاف بھرپور جدوجہد دونوں ملکوں کی ترقی پسند جمہوری اور امن دوست قوتوں پر اہم فرائض عائد کرتی ہے۔ ہمارے خطے میں عالمی سطح پر تبدیلیوں کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ولادی واستک اعلان کے بعد ہلسنکی طرز پر ایشیاء اور بحرالکاہل کے خطے میں سلامتی و امن کے عہد کے حالات بڑھ رہے ہیں۔ ایشیاء اور بحرالکاہل کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ یہ خطہ اب عالمی نشو و نما میں اہم مرکز بن چکا ہے اور آئندہ دہائیوں میں شمالی اوقیانوس کے خطے کے مقابلے میں اس کا عالمی مرکز بن جانا اب بعید از قیاس نہیں رہا۔

۔عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین میں تعلقات کی بہتری کے واضح رجحان، عوامی جمہوریہ چین اور ہندوستان میں تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششوں کے آغاز، جنوب مشرقی ایشیاء میں علاقائی مسئلوں کے حل ہونے کی جانب پیش رفت اور جاپان کی ترقی کی نئی سطح اور اس کے عالمی تعلقات کی نئی ضرورتوں کے زیر اثر خطے میں بالکل نئی صورت حال کے عوامل مضبوط ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں پاکستان کے سامراج

نواز حکمران طبقوں خاص طور پر سول ملٹری بیوروکریسی اور فوج کے عسکریت پسندانہ مفادات و جارحانہ عزائم کے باوجود "فرنٹ لائن اسٹیٹ" کے طور پر سامراج کا طفیلی مہرہ بننے کی اسٹریٹیجک بنیاد کمزور ہوتی جائے گی اور بدلے ہوئے حالات میں حکمران طبقے خطے میں امن اور معمول کے تعلقات کی جانب بڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

باب دوم

پاکستان کی سماجی ساخت

پاکستان میں دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی جدید نو آبادیاتی نشوونما

ہمارے ملک میں دیگر سائنسی علوم کی طرح سماجیاتی خاص طور پر علم منصوبہ بندی اور تحقیق و جستجو کی حالت تسلی بخش نہیں رہی۔ بورژوازی کے "اپنے لئے طبقہ" (CLASS FOR ITSELF) نہ بننے، اس کی مخصوص دست نگری (بشمول سماجی و نظریاتی پسماندگی) حکمران طبقوں کی پسماندہ آئیڈیالوجی، دانشورانہ تخلیق کا بیگانہ اور مستعار شعور (جو اسے سامراجی اداروں سے ملا) قومی نابرابری اور آمریت پسندی (AUTHORITARIANISM) اور فکری عمل کا "باہر کی جانب" (EXOGENOUS) سے ہونا اور عالمی تقسیم محنت کے طفیل، فکری و تجزیاتی درآمد اور زیادہ ترقی یافتہ جدید نو آبادیاتی ریاست نے آزاد کلچر، فکر و جستجو، تحقیق کی آزادی اور نشو نما پر روک لگا دی۔ جتنی یہ بیگانی اور جبر زیادہ تھا، اتنا ہی اس نے جمہوری، سیکولر اور سائنسی و قومی فکر کی نشونما کو معذرت خواہانہ اور قنوطیت پسند بنادیا۔قدیم روایتی ڈھانچوں کے زوال سے جو رد عمل پیدا ہوا اس نے فکری میدان کو اور بھی زیادہ بنجر کردیا۔

بورژوا قحط الرجالی کے اس ماحول میں جبکہ آئیڈیالوجیکل جبر چالو سکہ ہو۔ ایسی سماجی نشونما، جس کی سماجی تفریق (SOCIAL STRATIFICATION) کافی دھندلی ہو اور ایک نومولود ریاست میں درمیانی پرتوں کے دانشوروں کے لئے اوپر کی جانب چھلانگ لگانے کے کافی مواقع موجود ہوں، اور جہاں طبقاتی اور قومی تحریکوں کا ورثہ لٹاپٹا ہو، کمیونسٹ

تحریک کے لئے سماجی تجزیہ کا معاملہ ایک ناقابل حل معمہ بنا رہا ہے۔ پتھرائی ہوئی عقیدہ پرستی اور تجربیت پسندی نے، اپنے ٹھوس تاریخی اور سماجی حالات کے تخلیقی تجزیہ اور اس پر مبنی انقلابی تھیوری کو پنپنے نہ دیا اور تنگ نظری اور ضابطہ پرستی کے کلچر نے، مارکسی لیننی سماجی سائنس کی انقلابی روح کو دبا دیا۔ پاکستان کی کمیونسٹ تحریک میں سماجی ساخت کے تجزیہ کے سوال پر حکمت عملی کا سوال حاوی رہا ہے۔ جبکہ تجزیہ و ساخت کو ایک "طے شدہ امر" جانا گیا۔ عام طور پر اپنے بنیادی مفہوم میں ایک ہی طرح کا گھڑا گھڑایا فارمولا حاوی رہا ہے اور اس سے قطع نظر سیاسی نتائج اخذ کئے جاتے رہے ہیں۔

پاکستان کے مارکسیوں کا سماجی تجزیہ چند مفروضات پر قائم تھا۔ "پاکستان میں جاگیردارانہ طرز پیداوار غالب ہے" ہر نوع کے رجحان کے لٹریچر میں اس فارمولیشن کو مقدس آیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بارے میں جو مفروضاتی اور تجربی حقائق پیش کئے جاتے ہیں نہایت متضاد اور مضحکہ خیز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ میں صنعتی سرمایے کے غلبے سے ہندوستان کی زراعت سرمایہ داری کی فاضل (RESERVE) بن گئی زراعت اور دستکاری، مینو فیکچر کی علیحدگی وجود میں آئی اور مالیاتی سرمائے یا جدید سامراج کے وجود میں آنے اور مقامی طور پر سرمائے کی تشکیل کے عمل سے جاگیردارانہ زوال کا عمل اور تیز ہوا۔ بعد از نوآبادیاتی دور میں، سرمایہ دارانہ نشونما کے تیز عمل میں زراعت کے معاشی زائد کی سرمایہ دارانہ شعبوں کے حق میں اضافی تقسیم نو، مارکیٹ میکنزم اور مالی پالیسیوں، سرمایہ دارانہ منڈی کے فروغ کے ساتھ سرکولیشن کے دائرہ میں بے پناہ اضافے، زرعی اشیاء و اجناس اور خام مال (بشمول برآمدات) کی قومی و عالمی منڈی کے لئے بطور اشیائے تجارت پیداوار اشیاء کی جگہ زر کے رشتوں کا فروغ، "سبز انقلاب" کا تین دہائیوں کا زور دار عمل جس نے فرسودہ آلات پیداوار اور دقیانوسی طریقہ ہائے پیداوار کو بہت تیزی سے بدلا ہے۔ تین نام نہاد زرعی اصلاحات جنہوں نے پیداواری رشتوں میں تبدیلی اور زرعی سرمایہ داری کے عمل کو مہمیز لگائی۔ زراعت میں تجارتی سرمائے کا عمل دخل اور زراعت کی تجارتی بنیادوں پر تبدیلی کسان گذارہ معیشت کا سرمائے کے شکنجے میں آنا اور اس کا زوال بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ زراعت کی برتری کا روز بروز بڑھنا اور سرمایہ دار کاشتکار کا پھیلاؤ زمین سے بڑے پیمانے کی بید خلیوں، کسانوں میں بڑھتی ہوئی تفریق بے روزگاری، دیوالیہ پن میں بڑے پیمانے پر اضافہ میکانائزیشن والی سرمایہ دارانہ کاشت کا بڑھنا اور اس کی ضرورت میں آئے دن زراعت کا سرمائے پر بڑھتا ہوا انحصار اور اندرونی منڈی کے پھیلاؤ کی بڑھتی ہوئی ضرورت، زراعت میں

سرمایہ دارانہ فروغ کے حکومتی اقدامات تجارتی، صنعتی اور نوکر شاہی سرمائے اور کالے دھن کی زراعت میں سرمایہ کاری، زمینی ملکیت کے ڈھانچے میں گزشتہ دہائیوں میں تبدیلیاں، کاشت بوائی، کٹائی، بیجوں، کھاد، پانی، کرم کش ادویات سے لیکر فصلوں کی کاشت کے ڈھانچے کا جدید سائنسی تیکنیکی و مشینی اور منڈی کی ضرورت کے مطابق سرمایہ دارانہ طرز پر بتدریج بدلنا، زرعی کاروبار کا پھیلاؤ وغیرہ، یہ تبدیلیاں بڑے اور درمیانے زمینداروں اور خوشحال کسانوں کی بالائی پرتوں کے مفادات میں زیادہ آئیں، اور یہی وہ طبقاتی رخ ہے، جس نے طبقاتی تفریق کے عمل کو تیز کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ بدترین افلاس، بیروزگاری، نیم بیروزگاری، اور زمین سے بیدخلی کا شکار ہوا جس سے " آزاد محنت کش" کی تشکیل کا عمل تیز ہوا۔ چونکہ زراعت میں سرمایہ دارانہ نشو نما کا عمل بہت پیچ میل اور ناہموار ہے، اور یہ قبل از سرمایہ دار ڈھانچوں کو تباہ کرنے کے ساتھ قائم بھی رکھے ہوئے ہے اور اسے اپنے مفاد میں استعمال (ADAPT) بھی کرتا ہے۔ زراعت کی تیکنیکی بنیاد ابھی بھی کافی پچھڑی ہوئی ہے۔ خاص طور پر چھوٹے پیمانے اور خاندانی کسان کی معشت میں یہ زیادہ پچھڑی ہوئی ہے اور ایک نہایت بے ترتیب عمل سے گزر رہی ہے۔ حالانکہ معاشی جبر حاوی ہوتا جارہا ہے لیکن غیر معاشی جبر (EXTRA ECONOMIC COERCION) زرعی سرمایہ داری کے بڑے زمیندار طبقے کے حق میں ہونے کے سبب ابھی بھی بہت سی صورتوں میں موجود ہے۔ اس لئے "آزاد محنت کش" طبقے کی تشکیل کا عمل بہت پیچیدہ ہے۔ مزدور نیم کسان، نیم مزدور، نیم مالک، نیم بیروزگار اور دیوالیہ کسانوں کی پرتوں کی تشکیل کا نہایت گنجلک پراسس جاری ہے، اور اس کی سمت یہی ہے کہ ذرائع و آلات پیداوار اور اشیائے تجارت کی پیداوار سے براہ راست پیداوار کرنے والے بیگانہ ہوجائیں اور خود براہ راست پیدا کرنے والا بتدریج "آزاد محنت کش" بنتا چلا جائے۔ اس نشو ونما کا اہم ترین تضاد یہ ہے کہ یہ براہ راست پیدا کرنے والوں کو ذرائع پیداوار سے علیحدہ تو کرتی ہے۔ لیکن اسی سطح پر محنت کاروں کو روزگار مہیا نہیں کرتی اور یہی پرولتاریہ کی بطور طبقہ تشکیل کہیں زیادہ پچھڑی رہ جاتی ہے۔ زمین پر آبادی کے دباؤ بڑھنے سے اور چھوٹی معیشت کے بڑے پیمانے پر پھیلاؤ کے باوجود اس کا بحران لاحل ہے، یہ منڈی کے دوہرے دباؤ میں پھنس کر بدترین بحران کی لپیٹ میں ہے۔ مختلف اضلاع اور علاقوں میں زراعت میں ان تبدیلیوں کا عمل اور مختلف زرعی طبقوں میں اس کا اثر اور کردار مختلف ہے جس نے صورتحال کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور ملک میں سرمایہ دارانہ اجتماع اور ارتکاز میں استعمال ہونے اور منڈی کے رشتوں کے حاوی ہونے کے نتیجہ میں قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچوں کی

آزاد حیثیت بھی ختم ہوچکی ہے۔ ایسے میں جاگیر دارانہ باقیات کے نام پر جو مختلف صورتوں میں موجود ہیں اور کافی عرصہ تک رہیں گی، بڑی زمینی ملکیت جس کا طرز پیداوار سے کوئی تعلق نہیں اور استحصال کی بعض صورتیں جو پرانے طرز کی ہیں کے حوالے سے (جیسے کم ہوتا ہوا اور بدلتا ہوا بٹائی کا نظام) اور غیر معاشی جبر کی بعض صورتوں کے ناطے سے "جاگیردارانہ نظام پیداوار" کی تاویل بے معنی ہے۔ حالانکہ ابھرتی ہوئی سرمایہ داری نے ہر جگہ اور فتح مند ہونے کے بعد بڑے لمبے عرصہ تک غیر معاشی جبر کی صورتوں کو استعمال کیا۔ مزید برآں یہ کہ پرانے پیداواری رشتے ترقی یافتہ پیداواری قوتوں کے مقابلہ میں کم تیزی سے بدلتے ہیں۔ اور ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ زراعت میں قبل از سرمایہ دارانہ رشتوں کا نہ صرف زوال ہوا ہے، بلکہ ان کی بنیاد کافی بدلنے کی وجہ سے یہ ایسی باقیات ہیں، جو رفتہ رفتہ ختم ہوں گی۔ "پیداواری رشتوں" کے زمرے (CATEGORY) کو بہت سطحی طور پر استعمال کرنے والوں کو غالباً یہ بھی اندازہ نہیں کہ مزارع اور زمیندار کا پرانا تعلق کتنا بدل چکا ہے، اور کس تیزی سے کم ہوتا جارہا ہے، ثقافتی اور سماجی پسماندگی جو کافی موجود ہے کے حوالے سے سیاسی معشت کے قوانین اور زمروں کا تعین تو اور بھی مضحکہ خیز ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ نامیاتی طور پر سرمایہ دارانہ نظام پیداوار زراعت میں تشکیل پاچکا ہے اور سرمائے اور محنت کا تضاد بنیادی حیثیت اختیار کرگیا ہے اور دیہات میں دیہی پرولتاریہ ایک واضح طبقے کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ حالانکہ اس کی تشکیل کا کٹا پھٹا اور بکھرا ہوا عمل جاری ہے، ایک گمراہ کن نتیجہ ہوگا جیسے کہ ہمارے بعض سادہ لوح (SIMPLETONS) لیکن موضوعیت پسند و بے صبر مارکسٹ کرتے ہیں۔

فارمولیشن کی یہ دو انتہائیں، یہاں کی مخصوص دست نگر سرمایہ دارانہ نشو نما کو نہ سمجھنے کے باعث ہیں۔ یہ نشو نما ایک طرف قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچوں کو تباہ کرتی ہے۔ اور انہیں سرمایہ داری کے دائرے میں کھینچ لاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا جاتا ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار اپنی مکمل شکل میں تشکیل پاچکا ہے۔ اور دوسری طرف یہ قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچوں اور باقیات کو بعض صورتوں میں قائم (CONSERVE) بھی رکھتی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جاگیردارانہ طرز پیداوار حاوی ہے۔ ہماری سماجی ساخت عبوری کرداری خصوصیت رکھتی ہے۔ جس میں سرمایہ داری اپنے ارتقا بازار کے لئے مال تیار کرنے کی معیشت کے ابتدائی آثار سے شروع کے سیدھے تبادلے سے لیکر سب سے اعلیٰ شکل یعنی بڑے پیمانے کی پیداوار تک کی خصوصیات کے ساتھ حاوی سماجی ساخت ہے۔ موجودہ مرحلے میں یہ سرمایہ دارانہ نشونما

کی خصوصیت ہے، کہ قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچوں کی باقیات مثلاً غیر معاشی جبر کی بہت سی صورتیں باقی رہتی ہیں۔

ایک رجحان یہ بھی بنا کہ ہمارے سماج کو نیم نوآبادیاتی، نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام قرار دیا جانے لگا جو کسی بھی طرح "نیم جاگیرداری" اور نیم سرمایہ داری کی مقداری اور صفتی خصوصیات اور ضدین کے اس اتحاد کے باہم تعلق کو ظاہر نہیں کرتا، یہ ایک ڈھیلی ڈھالی تجریدی فارمولیشن ہے جس کی حسب سہولت تشریح کر لی جاتی ہے عام طور پر اس مرکب میں جاگیرداری کو حاوی سمجھا جاتا ہے اس فارمولیشن سے سماجی عمل کو کسی واضح سمت میں نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ ہی متضاد مظاہر کے اندرونی رشتے کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

پاکستان کی سماجی ساخت کی عمومی خصوصیات

نوآبادیاتی دور کے خاتمے پر سامراج اور اس کی نوآبادیوں کے درمیان رشتے کی نوعیت بدل گئی۔ مابعد نوآبادیاتی دور میں دوسرے نوآزاد ممالک کی طرح جنہوں نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ رہتے ہوئے سرمایہ دارانہ راہ اپنائی، پاکستان میں مخصوص سماجی نشوونما نہایت گنجلک اور متضاد خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ عالمی تقسیم محنت میں مقام اور نوآبادیاتی ورثہ ایسا نہیں تھا کہ یہاں پر خود مختار سرمایہ دارانہ نشوونما ہوتی یہ جتنی عالمی سرمائے کے مرکز سے متعین و مشروط ہوئی اتنی ہی دست نگر اور (EXOGENOUS) تھی یوں نواحی سرمائے کی تشکیل کا عمل ایسے حالات میں ہوا جب مقامی طور پر سرمائے کا اجتماع اور ارتکاز بہت بکھرا ہوا اور منتشر تھا اور قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچوں کی مجہولیت حاوی تھی، قطعی مختلف تاریخی حالات میں جدید نوآبادیاتی ریاست کی سرپرستی میں سرمایہ دارانہ ارتقاء کے مختلف مراحل بیک وقت اور کئی مرحلوں کو پھلانگتے ہوئے یوں وقوع پذیر ہوئے۔ کہ قبل از سرمایہ دارانہ ڈھانچے (جو پہلے ہی زوال پذیر تھے) دقیانوسی خلوت گنوا کر تیزی سے تباہ ہوتے گئے ہیں اور بتدریج بدلتے جا رہے ہیں اور سرمایہ داری کے اجتماع اور ارتکاز کے وسیع عمل کا حصہ بن گئے ہیں نجی و ریاستی سرمائے کے اجتماع اور ارتکاز کی مخصوص نوعیت کے سبب ایک بے میل سرمایہ دارانہ سماجی ساخت وجود میں آگئی ہے۔ چونکہ نجی سرمائے کا ارتکاز غیر مربوط تھا اس لئے نوکر شاہی ریاستی سرمایہ داری کے مرکزی ڈھانچے نے ناظم نظام ڈھانچے (STRUCTURE SYSTEM FORMING) کی حیثیت لے لی، ناہموار سرمایہ دارانہ ارتکاز جہاں بے میل اور بے ترتیب نشوونما میں مضمر ہے۔ وہاں عالمی سرمائے کے ساتھ اضافی و مطلق نابرابری کا تعلق خود کو مقامی سرمایہ دارانہ نشوونما میں اس طرح منعکس کرتا ہے کہ مقامی طور پر بھی

سرمائے کے ارتکاز کے مرکز (CORE) وجود میں آئے (کراچی، وسطی پنجاب) جو نواحی علاقوں اور مظلوم لوگوں (مظلوم قوموں) کے ذرائع کے استحصال اور مطلق و اضافی مارجلائزیشن کے رشتے پر مبنی ہیں۔

ابتدائی دور میں سامراجی سرمائے اور امپیریل سٹیٹ (یو ایس اے) نے جدید نو آبادیاتی نظام کے قیام کے لئے ضروری شرائط کی تشکیل پر زور دیا۔ دست نگر سرمایہ دارانہ اجتماع و ارتکاز جو عالمی تقسیم محنت کا پابند ہو اور ایک ایسی نشو و نما جو خارجی طور پر متعین (EXTERNALY INDNCED) شدہ ہو جدید نو آبادیاتی سیاق و سباق میں ریاست کی تعمیر جو عالمی سرمائے اور خطے میں امپیریل اسٹرٹیجک مفادات کو پورا کرنے کی آلہ کار ہو اندرونی طور پر ایسی سماجی صورتحال کی کنسالیڈیشن تخلیق و مضبوطی جو قومی حوالی ترقی کو مشکل بناتی ہو، بیرونی مقابلے کم از کم کرنے کے اقدامات، ایسے معاشی مادی بنیادی ڈھانچے (MATERIAL AND SOCIAL INFRASTRUCTURE) کی تشکیل (بذریعہ امداد قرض اور ٹیکنالوجیکل محتاجی) جو لمبے عرصے میں عالمی سرمائے کی جانب زائد (SURPLUS ECOONOMIC) کے بدترین استحصال، نابرابری کے معاشی رشتوں کے مربوط نظام، سامراجی مالیاتی اداروں کی بالادستی عالمی تقسیم محنت کے مفاد میں معاشی منصوبہ بندی، محنت کی قوت کے بدترین استحصال "گماشتہ کھپت اور تابعداری کا کلچر" اور مقامی منڈی پر عالمی قیمتوں اور پیمانوں (PARAMETRES) کا غلبہ وغیرہ۔

عالمی سامراج نے ایک ایسے جدید نوآبادیاتی سماجی نظام کی تشکیل کی ہے جس میں سماجی رشتے "باہر سے پیدا کردہ" سرمایہ دارانہ توسیع و اجتماع کے عمل (DYNAMIC). سے بندھے ہوئے ہیں۔ جنہیں آمرانہ حکومتوں خاص طور پر نئی طرز کی بونا پارٹسٹ (NEO BONAPARTIST) حکومتوں کے ذریعہ مستحکم (REINFORCE) کیا جاتا ہے۔ جدید نو آبادیاتی ریاست اور عالمی سامراج کے مابین ایسا دوہرا رشتہ وجود میں آیا ہے کہ جدید نوآبادیاتی ریاست عالمی سامراج (امپیریل ریاست) کی مداخلت اور سرپرستی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور جدید نوآبادیاتی ریاست سامراجی سرمائے کے اجتماع سے پیدا شدہ تصادم و بحران کو قابو میں نہیں رکھا جاسکتا۔

مقامی طور پر سرمائے کے اجتماع کا عمل عالمی سرمائے کے عمل کے حصہ کے طور پر بنیادی طور پر علیحدہ و خود مختار حیثیت کا حامل نہیں۔ بلکہ عالمی پیمانوں PARAMETERS غیر مساوی عالمی تقسیم محنت، نابرابری کے معاشی رشتوں اور عالمی سرمایہ داری کے پیمانوں (IMPERATIVES) سے متعین ہوتا ہے۔ پاکستان کی دست نگر نشو نما (سرمایہ دارانہ) میں عالمی سرمائے اور ریاستی اجارہ دار سرمایہ داری (امپیریل

اسٹیٹ) نے جو کردار ادا کیا ہے اور جتنی زیادہ مقامی سرمایہ کی تشکیل نے اس پر انحصار کیا۔ اتنی ہی مناسبت سے دست نگری کے رشتے وجود میں آئے ہیں۔ اس رشتے کے مختلف اثرات اس سرمایہ داری میں تجارتی، پیٹی بورژوا چھوٹی ملکیت دار اور درمیانی پرتوں کا بڑا ہجوم غالب رہتا ہے اور سماجی تفریق یا سرمایہ داری کے پیداواری رشتوں کی تشکیل کا عمل پیداواری سرمائے کی نشوونما سے نہایت کم تر اور الٹ (INVERSE) تعلق میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔ نتیجتاً ذرائع پیداوار سے براہ راست پیداوار کرنے والے کی علیحدگی اور بیگانگی کے وسیع عمل کے باوجود آزاد و محنت کش (FERE LABOURER) کی تشکیل کا عمل نہایت سست رہتا ہے، اور سرمائے و محنت کے تضاد پر سرمایہ داری کے پیداواری رشتے کو تشکیل کرنے والے بنیادی طبقوں (MAJOR CLASSES) کا ڈھانچہ بکھرا ہوا رہ جاتا ہے۔

اس بیچ میل سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی یہ متضاد خصوصیت ہے کہ یہ زراعت کو اس سے قطع نظر کہ استحصال کی صورتیں FORMS OF APPROPRIATION کیا ہیں بنیادی سرمائے کے اجتماع کے وسیع دائرے میں کھینچ لائی ہے۔ یہ ایک طرف سادہ اشیائے پیداوار PETTYCOMMODITY PRODUCTION کے ڈھانچوں اور دوسری جانب غیر معاشی جبر EXTRA ECONOMIC COERCION کی بہت سی صورتوں کی حامل زرعی پیداوار (چھوٹی بڑی) کے بہت سے ڈھانچوں کی خلوت علیحدگی کو ختم کرکے انہیں بنیادی سرمائے کے اجتماع کا حصہ بناتی ہے۔ اور دوسری جانب یہ ڈھانچے جہاں اشیائے تجارت یا نیم اشیائے تجارت کی پیداوار کے حاصل ہوجاتے ہیں۔ وہاں پرانے رشتے تیزی سے زوال کے باوجود اس طرح ساتھ گھسٹتے جاتے ہیں، کہ براہ راست پیداوار کرنے والوں کی ذرائع پیداوار سے علیحدگی و بیگانگی، "آزاد محنت کش" کی تشکیل کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ صنعت و زراعت کے اس مخصوص عمل کے نتیجہ میں آبادی کا بڑا حصہ افلاس زدہ MARGINALIZED بیگاری و آوارہ گردی LIMPONIZATION (کم روزگار و ناداری POVERTY کا شکار ہوجاتا ہے۔ ان کے مطلق و اضافی استحصال کی بنیاد پر مطلق و اضافی زائد قدر کا عمل فروغ پاتا ہے۔

مستقل سرمائے کا اوسط اعلیٰ شرح جو عالمی پیمانوں سے متعین ہوتی ہے اور قدر تبادلے کا تعین غیر مساوی شرائط تجارت کے تحت ہوتا ہے، مقامی بورژوازی اور صنعت خواہ متبادل درآمد یا برآمدی رخ کی حکمت عملی کے تحت وجود میں آئی ہو سرمائے کی نامیاتی تشکیل کی ابتدائی اعلیٰ سطح اور جڑی ہوئی قدر زائد کی کم ہوتی ہوئی شرح کی صنعت کاری کے فروغ اور معشت کی تیکنیکی تبدیلی کو بہت کٹھن بنا دیتی ہے۔

•دست نگری کی خصوصیات کا حامل ہونے کے باوصف پیداواری سرمائے کا عمل تو یہ "اضافی افادے کے نظریہ" THEORY OF RELATIVE ADVANTAGE اور نہ آزاد مقابلے LAISES FRAIRE کے خطوط پر کھڑا ہوسکتا ہے، بلکہ اس کا جتنا زیادہ انحصار مارکیٹ میکنزم کے کنٹرول پر ہوتا ہے اتنا ہی ریاست کی معاشی زندگی اور منڈی کے میکنزم میں مداخلت بڑھتی ہے۔ جس کی سرپرستی آسان قرضوں، تحفظات، اشیائے تجارت کی عالمی پیمانے پر بالخصوص میں زیادہ قیمتوں، برآمدی بعض رعایات، امدادی رقوم، مالیاتی پالیسیاں، شرح تبادلہ اور سماجی تفریق پر مبنی منصوبہ بندی کے بغیر مقامی صنعت و بورژوازی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوسکتی، اور یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ زائد قدر کی تقسیم کو زیادہ سے زیادہ بنیادوں پر بورژوازی کے حق میں ہو۔

چھوٹے پیمانے کی صنعت و سرمایہ دارانہ پیداوار، مستقل سرمائے کی اعلیٰ شرح، شدت سرمایہ والی تیکنک کی اعلیٰ سطح اور منڈی میں عالمی و قومی اجارہ داریوں کے باعث شدید دباؤ کا شکار رہتی ہے۔ اور نت نئے بحرانوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ اس کی تیکنکی بنیاد اور سکیل کی وسعت میں ترقی و تبدیلی مشکل ہوجاتی ہے۔ اصل میں مقامی صنعت کا یہی وہ ڈائنامک شعبہ ہے جو مقامی و عالمی اجارہ داریوں سے مسلسل عالم، تضاد میں رہتا ہے۔ چونکہ اس میں مستقل سرمائے کی شرح اور سرمائے کی نامیاتی تشکیل پچھڑی ہوئی ہے۔ لہذا غیر مستقل سرمائے اور محنت کی شدت والی پیداوار پر اس کا دارومدار زیادہ ہوتا ہے۔ سرمائے کی نامیاتی تشکیل کی کمی سے زائد قدر کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اسے مطلق قدر زائد کی پیداوار سے پورا کیا جاتا ہے۔ محنت کے استحصال کی جبری COERCIVE صورتیں یہاں عام ہیں۔ جس سے محنت کی پیداواری صلاحیت کم ہوجاتی ہے نتیجتاً قوت محنت کی قدر کے مقابلے میں اس کی قیمت بالعموم کم رکھی جاتی ہے۔

پاکستان میں جدید نوآبادیاتی سرمائے کے اجتماع کا عمل اندرونی و بیرونی نا برابری کے رشتوں اور غیر مساوی مارکیٹ میکنزم میں پروان چڑھتا ہے نتیجتاً سرمائے کے اجتماع کے مقام LOCALS OF ACCUMULATION سرمائے کے ذرائع اجتماع کے مقام کو دوہری نابرابری کا شکار کرتے ہیں اور اس سے کٹے ہوتے ہیں۔ قومی و عالمی سرمائے کے اجتماع کا یہ مخصوص عمل دوہری نابرابری کے رشتے تشکیل کرتا ہے۔ ایک جانب جس تناسب سے عالمی سرمائے کے اجتماع کے عمل میں زائد قدر اور دیگر ذرائع اجتماع میں عالمی سرمائے کے مرکز "CORE" کا حصہ بڑھتا ہے۔ اسی تناسب سے ہمارے ملک کے دست نگریا (نواحی سرمائے) کے اجتماع کا عمل مطلق و اضافی طور پر کم ہوتا ہے۔ اور دوسری جانب جتنا نواحی سرمائے کے ارتکاز و اجتماع کا عمل بنیادی سرمائے میں کمی کا

شکار ہوتا ہے اتنا ہی یہ مجبور ہوتا ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قوت محنت کا استحصال بڑھائے اور اندرونی طور پر بچی کچھی زائد قدر کی اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ تقسیم نو کو بروئے کار لائے (بمقابلہ دیگر استحصالی طبقوں کے حصہ کے) لیکن اس کی اپنی حدود میں جو بنیادی سرمائے کی تشکیل کے لئے پوری طرح ممد نہیں ہیں۔ لہذا "نواحی سرمایہ" دست نگر سرمائے کے "مراکز" کی تشکیل کرنے کے لئے اپنے سے باہر کے علاقوں کو نواحی علاقوں میں بدل کر عالمی سرمائے سے نابرابری کے رشتے کی اندرون ملک تجدید پیداوار REPRODUCTION کرتا ہے۔ دست نگر سرمائے کے اجتماع کے یہ "مراکز" (کراچی اور وسطی پنجاب) اوپر سے مسلط کی گئی تقسیم محنت کے تحت قدر زائد اور ذرائع ارتکاز (سماجی طور پر ضروری سرمایہ، محنت، بنیادی اشیاء معدنیات، خام مال، وغیرہ) کے ان علاقوں کی جانب زیادہ سے زیادہ تقسیم نو کے ذریعہ "نواحی علاقوں" کو سٹرکچرل ناہمواری کے رشتوں میں جکڑ دیتا ہے۔ نتیجتاً ایک طرف سرمائے کے اجتماع کے دو مراکز وجود میں آئے اور دوسری طرف وسیع "نواحی علاقوں" میں جہاں روایتی ڈھانچوں کا زوال تیز ہوا وہاں ان نواحی علاقوں میں بنیادی سرمائے کی تشکیل اور مقامی منڈی نہایت پچھڑی ہوئی حالت میں رہ گئی۔

اس طرح نواحی سرمائے کے جو ترقی یافتہ "مراکز" وجود میں آئے وہ اپنے اور اپنے سے باہر کے علاقوں کے ذرائع اور معیشتوں سے دوہرا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نواحی علاقوں کی قیمت پر زیادہ ترقی یافتہ مادی و سماجی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر ترقی یافتہ ذرائع رسل و رسائل سرمائے کی تشکیل کے لئے ضروری سہولیات و لوازمات کا ان علاقوں میں ارتکاز اور نواحی علاقوں سے سماجی طور پر ضروری سرمائے، بنیادی اشیاء، خام مال، معدنیات، و دیگر وسائل کی سرمائے کے مراکز والے علاقوں کو منتقلی سے ان علاقوں کے تنزل و پسماندگی کے نتیجہ میں نشو نما کے دو پیمانے وجود میں آئے ہیں۔ اول الذکر علاقوں (مراکز) میں ترقی اور سرمایہ کاری کے زیادہ سے زیادہ مناسب حالات اور موخر الذکر میں پسماندگی اور ترقی کے مخدوش حالات۔ نتیجتاً نام نہاد "آزاد منڈی میکنزم اور قوانین" بالا دست علاقوں" کی موافقت اور "محروم علاقوں" کی ناموافقیت میں حرکت میں آتے ہیں۔ مختلف علاقوں کی مجتمع کشمکش CUMMULATIVETRACTION کا یہ سٹرکچرل فرق مارکیٹ میکنزم سے مل کر نشو نما کی مختلف شرحیں پیدا کرتا ہے۔ جو نابرابری کو اور بڑھتاتی ہے۔ یہ فقط علاقائی نابرابری کا معاملہ نہیں بلکہ کثیر القومی مملکت میں مختلف قومیتوں کے متفرق حالات کو DIVERSITY OF CONDITIONS سیاسی اقتدار اور ریاست کی قومی جبر کی جہت DIMENSION نے سیاسی و معاشی جبر کی حکمت عملی کے ذریعہ قومی

نابرابری میں بدل دیا قومی جبری نابرابری کا "FORCED INUQUALITY" یہ عمل دو متضاد صورتوں میں وقوع پذیر ہوا۔ جبکہ ہر دو صورتوں کی نوعیت میں بھی فرق، VARIATIONS ہیں سرمائے کے بڑے اجتماع کے مراکز کراچی اور وسطی پنجاب میں فرق یہ ہے کہ: وسطی پنجاب میں بنیادی سرمائے کا اجتماع اس کی اندورنی معیشت کی ترقی اور ملک بھر سے ریاستی ڈھانچے میں پنجابیوں کی بالادستی کے باعث اس کے حق میں زائد قدر و دیگر ذرائع کی تقسیم نو کے نتیجے میں وجود میں آیا جبکہ وسطی پنجاب میں بنیادی سرمائے کا اجتماع اور جدید منڈی کی تشکیل اس کے قومیتی ڈھانچے سے مطابقت رکھتی ہے۔ جبکہ کراچی کے مرکز میں سرمائے کا اجتماع (جو کہ وفاقی دارالخلافہ رہا اور پورٹ سٹی ہے) تمام ملک کے سرمائے کے ذرائع زائد، قدر اور مظلوم قوموں کے ذرائع سے وجود میں آیا ہے، جس میں پنجاب کے سرمائے اور محنت کا بڑا حصہ بھی شامل ہے۔ کراچی میں سرمائے کے اجتماع اور اس کے گرد تشکیل پانے والا سماجی معاشی نسلیا ڈھانچہ (مالیاتی سرمایہ، صنعتی سرمایہ، تجارتی سرمایہ، خدمات، محنت وغیرہ) سندھی قومی منڈی کو پہلے سے قبضانے PREMPTION کے ذریعہ سندھی قومی علاقہ پر بیگانہ منڈی مسلط ہونے سے ایک طرح کی کالونائزیشن کا پراسس وجود میں آیا۔ وسطی پنجاب اور کراچی کے مراکز میں سرمائے کا اجتماع گہرے طور پر باہم جڑا ہوا ہے۔ نشو نما کی دوسری صورت مظلوم قوموں میں وقوع پذیر ہوئی جس نے تین صورتیں اختیار کی۔

اول پختون خواہ: ۔یہاں رواتی ڈھانچوں کا زوال اور اس کی نشونما جتنی تیز تھی اتنی ہی سماجی طور پر ضروری سرمایہ، دیگر ذرائع، تجارتی سرمایہ، محنت اور زائد قدر کا انخلا تیزی سے سرمائے کے بڑے اجتماع کے مرکز کراچی کی جانب ہوا۔ نتیجتاً پختون خواہ میں بنیادی سرمائے کی تشکیل کی بنیاد پر قومی منڈی کی تشکیل تجارتی سرمائے کے پھیلاو کی سطح پر رک گئی اور جتنی یہ رکی اتنا ہی اس نے انخلا کو اور بڑھایا۔

دوم سندھ کے شہروں اور منڈی پر بیرونی غلبے سے سندھی سرمائے کی تشکیل بہت زیادہ رک گئی، جس سے زراعت میں روائیتی ڈھانچوں کا زوال اور سست ہوگیا، جونہی سندھ میں زرعی سرمایہ داری کا فروغ ہوا متوسط اور نچلی پرتیں پھیلیں۔ ابتدائی و تجارتی سرمائے کی نشونما بڑے سرمائے کے اجتماع کے مقابلے میں بے بس ہوکر رہ گئی نتیجتاً سندھی قومی منڈی تشکیل پانے کے حالات نہایت مخدوش ہوگئے ہیں۔

سوم بلوچستان: ۔یہاں کے قومی ذرائع خاص طور پر معدنیات، تجارتی سرمائے بجائے اس کے مقامی منڈی کی تشکیل کے کام آتا سرمائے کے اجتماع کے مراکز کی ترقی کا ذریعہ بنا، بلوچستان کے علاقے کے روائیتی ڈھانچوں کا زوال ویسے بھی سب سے زیادہ سست

ہے اس لئے متوسط پرتیں اور تجارتی سرمایہ پچھڑا ہوا ہے، جس کی نشو نما پر یہاں کے ذرائع اور اس کے قدر زائد کے انخلا نے اور بھی روک لگادی البتہ چھوٹے اور بکھرے ہوئے بڑے پیمانے پر جو ابتدائی و تجارتی سرمایہ تشکیل پارہا ہے اس میں پختون علاقوں کی تجارت پور ژوازی یادہ فعال ہے۔

سماجی ساخت کے آغاز تاریخی سیاق و ترتیب اور اس کی مخصوص سیاسی معیشت کی پیچیدگیوں کا عمومی اور تھیور ٹیکل جائزہ لینے سے جو صورت سامنے آتی ہے وہ بذات خود ہی اس امر کی غماز ہے کہ ایسی بے ترتیب بے میل ناھموار نشو نما جس کے عبوری مرحلے میں اس کی سماجی و معاشی بنیادوں کے بہت سے پہلوؤں کو سرمایہ داری متوازن صورت میں ترتیب نہیں دیتی۔ سماجی ڈھانچے کے مختلف عناصر معاشی، سماجی، سیاسی، انتظامی، نظریاتی اور ثقافتی جن کا باہم تال میل معاشرے کی حقیقی زندگی کی تشکیل کرتا ہے، ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں اس لئے سماجی نشو نما میں شدت سے عمل دخل حاصل کرلیتے ہیں۔ ایک طرف روائیتی ڈھانچوں کا زوال تیزی سے ہوتا ہے اور ان کی تبدیلی اس سرعت سے نہیں ہوتی دوسری جانب سرمایہ داری حاوی ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اس قابل نہیں ہوتی کہ سماجی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ جدید نوآبادیاتی ڈھانچے کے اندر استحصالی طبقوں کی باہم کشاکش طبقاتی تضادات کے پیچیدہ و وسیع عمل کے ساتھ ساتھ قومیتی تضادات کی بڑھتی ہوئی شدت اور ریاست کا حد سے بڑھا ہوا کردار یہ سب مل کر جہاں ایک بہت ہی کثیر النوع اور تضادات سے بھرپور سیاسی معاشی تسلیاتی کثرت حالات کا منظر پیش کرتے ہیں، وہاں سماجی ڈھانچوں کا بحران اور سیاسی افراتفری سرمایہ داری کے پختہ مرحلے کے بحران کی غماز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ابتدائی مراحل اور وہ بھی کئی مرحلوں کے امتزاج والے مرحلے کے بحران کی مظہر ہے۔ ہمارے ملک کی مخصوص طبقاتی قومیتی ریاستی نوعیت اور سماجی نشو نما کے مخصوص کردار کی بنا پر اصلاحی راستے کے امکان محدوش ہیں اور ہر بحران آمرانہ نیو بونا پارٹسٹ حکومتوں کو جنم دیتا ہے۔

سرمایہ داری کا باہر سے اندر کی جانب والا کردار EXOGENOUS تضادات کے ایک سلسلے پر (کہ ابھی وہ پختہ نہیں ہوئے ہوتے) اگلے مرحلے کے تضادات کا تھونپا جانا سماجی نشو ونما کے مرحلوں کا پھلانگا جانا، قبل از سرمایہ داری کا تیز زوال اور سست رو تبدیلی دقیانوسی ڈھانچوں اور استحصال کی صورتوں کا سرمایہ دارانہ نشو نما کا حصہ بن کر ساتھ ساتھ گھسٹتے جانا دست نگر سرمائے کے اجتماع کے عمل میں ایک نامیاتی سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے پختہ ڈھانچے کی عدم موجودگی میں اس سرمایہ دارنہ ساخت میں بنیادی طبقوں کی تشکیل کے عمل کا پچھڑا رہ جانا نام نہاد جدید شعبوں اور روائتی شعبوں کا وسیع

سرمایہ دارانہ عمل میں باہم جڑے ہوئے ہونا خاص طور پر زائد قدر کی پیداوار جو تمام نشو نما میں پنہاں ہے کا سرمایہ دارانہ رشتوں کی بے میل حالت میں پیدا ہونا، پیداواری رشتوں کی تشکیل کے عمل کو بہت ہی گنجلک بنا دیتا ہے۔ ایسی سماجی ساخت جس میں جدید نوآبادیاتی ریاستی ڈھانچہ ڈھانچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو اور سماجی اور معاشی و سیاسی زندگی میں حد سے بڑھا ہوا کردار ادا کرے اور سول و ملٹری بیورو کریسی سیاسی اقتدار کی تشکیل اور استحصالی طبقوں کے مفادات کے باہم تعین اور معاشی نشوونما کے رخ متعین کرنے میں مرکزی کردار ادا کرے، ریاست کی معاشی اور غیر معاشی سرگرمیاں سماجی ساخت، کے ساتھ اسی طرح گھتی ہوئی جاتی ہیں کہ ریاستی ڈھانچہ اور اس کے پورے دائرہ عمل کو جانچے بغیر سماج کا طبقاتی تجزیہ ممکن نہیں رہتا۔

جدید نوآبادیاتی ریاست۔ نوعیت اور طبقاتی/قومی کردار

جیسا کہ ہم بالتفصیل دیکھ آئے ہیں کہ ریاست مابعد نوآبادیاتی دور میں دیگر ڈھانچوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھی OVER DEVELOPED تھی اور جسے سامراج یا امپیریل اسٹیٹ نے دیگر ڈھانچوں کے مقابلے میں جدید نوآبادیاتی خطوط پر ترجیحی طور پر ترقی دی ہے۔ دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی خارجی طور پر متعین EXOGENOUS نشوونما اور عالمی سرمائے کی دست نگری سے پیدا شدہ لاتحل تضادات، دست نگر سرمائے کے اجتماع و ارتکاز اور مقامی بورژوازی BOURGEOISIE INDIGENOUS کے پچھڑا و بکھرا FRAGMENTED ہوا ہونے اور بے ترتیبی کی حالت "اپنے لئے طبقہ نہ بننے" زمیندار طبقوں کی متضاد اور پسماندہ حالت، گہری قومی نابرابری کے حالات اور حکمران طبقوں کے خواص میں "سیاسی سمجھوتہ" کی نااہلی کے پس منظر میں جدید نوآبادیاتی ریاستی ڈھانچہ دست نگر سرمایہ داری کے مجموعی مفادات اور سٹرکچرل تقاضوں STRUCTURAL IMPEERATIVES کے تئیں حد سے بڑھا ہوا کردار DETERMINING ROLE ادا کرتا ہے۔

بعض ماورائے طبقاتی مفروضوں کے برعکس، ریاست اور سیاسی طاقت تاریخی طور پر متعین طبقاتی بنیاد سے ماوراء نہیں ہے۔ یہ دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کے مخصوص طبقاتی استحصالی رشتوں کا پرتو ہے۔ جو اس مخصوص استحصالی ڈھانچے کے تقاضوں IMPERATIVES حکمران طبقوں کے مفادات اور سماجی عاملوں کے عمل سے وجود میں آتی ہے اور پلٹ کر سماجی نظام کی تجدید پیداوار کو یقینی بناتی ہے۔ اور حکمران استحصالی طبقوں کے مجموعی مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ پاکستان کی جدید نوآبادیاتی ریاست ایک

طرف میٹروپولیٹن اور عالمی سامراج اور دوسری جانب دست نگر بورژوازی کی مختلف پرتوں بورژوا رداستی ،زمیندار طبقوں، ریاستی سے منسلک نوکر شاہی سرمائے ۔(بیورو کرٹیک بورژوازی) اور سول اور فوجی بیور کریٹس کے مخصوص درمیانی گروہوں کے استحصالی مفادات کے مجموعے CONGLOMERATE کی نمائندہ اور محافظ ہے لیکن یہ اسکی طبقاتی و طفیلی جہت ہے۔ ایک کثیر القومی، غیر تاریخی ریاست میں قومی جبر و نابرابری کے غیر معمولی حالات میں، اس کی قومی جہت بھی ہے۔ جہاں یہ بنیادی طور پر پنجابی بالادست قوم اور (مہاجر گروہ) کے (خاص طور پر ان کے خواص کے) قومی بالادستی کے مفادات کی نگہبان اور مظلوم قوموں کے خواص کے بعض حصوں کو قومی عدم مساوات کی شرائط پر ساتھ ملاتی ہے۔ وہاں یہ مظلوم قوموں، سندھی، بلوچ، پختون اور سرائیکی لوگوں اور دیگر اقلیتی (قومیتی، نسلیاتی، و لسانی) گروہوں پر قومی جبر و استحصال کا آلہ کار ہے۔ مزید برآں طبقوں اور استحصالی مفادات کی کثرت میں ریاست کا زیادہ ترقی یافتہ ڈھانچہ، ان طبقوں سے انفرادی اعتبار سے اضافی طور پر خودمختار" AUTONOMOUS RELATIVELY ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حکمران استحصالی طبقوں کے منفرد مفادات میں کسی ایک واحد طبقے کا آلہ کار نہیں ہے۔ بلکہ ان استحصالی طبقوں اور ان کے مفادات میں مصالحت کنندہ MEDIATOR کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور دست نگر سرمایہ دارانہ ساخت کے عمومی سٹرکچرل تقاضوں کے تحت عمل کرتا ہے۔ لیکن یہ اسٹرکچرل تقاضے، میکانکی اور جبری یا DETERMINIST نہیں ہوتے جیسا کہ STRUCTURALIST تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ نہایت طاقتور سماجی و طبقاتی اور قومی و عالمی عاملوں کی جہد سے تشکیل پاتے ہیں۔ اور پلٹ کر سماجی نشو و نما کو متعین کرتے ہیں۔ ان سے متاثر ہوتے ہیں، اور انہیں متاثر بھی کرتے ہیں۔

اندریں حالات، جدید نوآبادیاتی ریاست، عالمی سامراج اور مقامی حکمران طبقوں کے ہم آہنگ و متضاد مفادات کی وھیکل VEHICLE ہے۔ اور دست نگری کے دائرے میں ان کے مابین کش مکش کا میدان بھی بنتی ہے۔ ریاست کے جدید اور زیادہ ترقی یافتہ ڈھانچہ کے موجب، سول اور فوجی نوکر شاہی، خاص طور پر اس کے بالائی حصے نہ صرف سیاسی اقتدار بلکہ سماجی نشوونما میں براہ راست یا بالواسطہ مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ حکمران طبقوں کے مابین سیاسی سمجھوتے میں حائل پیچیدگیاں، بے میل نشوونما کی بے ترتیبی سماجی ڈھانچوں کا بحران، دست نگری کے تضادات قومیتی تضادات اور مظلوم و محروم طبقوں اور عوام کے بڑے حصوں کی ناداری دست نگر سرمایہ دارانہ نشوونما کے ابتدائی اور ملے جلے مرحلوں کے تضادات سے پھوٹ کر نت نئے بحرانوں کا سبب بنتی

ہے۔ نتیجتاً ایسی مستقل بحرانی حالت میں ریاستی ڈھانچہ خاص طور پر فوج کا سول سوسائٹی کے تضادات کو دست نگری کے سماجی ڈھانچے میں برقرار رکھنے کے لئے (براہ راست یا بالواسطہ) مستقل کردار معمول بن جاتا ہے۔ لہٰذا نیو بونا پارٹسٹ مطلق العنان حکومتیں NEO BONAPARTIST AUTHORITARIAN REGIMES جنم لیتی ہیں۔ ملٹری بیورو کریٹک اولیگارشی "کنٹرولڈ جمہوریت" کی مختلف صورتوں کے ذریعے استحصالی طبقوں اور مختلف درمیانی گروہوں کو ساتھ ملا کر ان کے تضادات کو استعمال کر کے "سیاسی سمجھوتہ" مسلط کر دیتی ہے۔ اور نیو بو لو پارٹسٹ مطلق النعان حکومتیں مختلف طرح کے ریپبلیکن لبادے اوڑھ لیتی ہیں۔ نیز جدید نوآبادیاتی ریاستی ڈھانچے کے حد سے بڑھے ہوئے کردار، سماج کے ہر شعبے میں اس کی بے جامداخلت اور بھاری بھرکم موجودگی، طبقاتی و قومی جبر براہ راست ملوث رہنے اور اس ڈھانچے سے، سماج سے بالاتر ایک بیگانہ قوت کے طور پر اس کا نظریاتی بھرم طشت از بام ہوگیا۔ اور ریاست نہ صرف اسٹرکچرل بحران بلکہ نظریاتی بحران میں رہتی ہے۔

مابعد نوآبادیاتی دور میں میٹروپولیٹن / کالونی رشتے ختم ہونے پر سرمائے کے بنیادی اجتماع و اثر کا عمل اتنا بکھرا ہوا تھا کہ نجی سرمایہ دارانہ ڈھانچہ سماجی ساخت میں ناظم نظام ڈھانچے SYSTEM FORMING STRUCTURE کے کردار کی پوزیشن میں نہ تھا، دست نگر سرمایہ دارانہ نشوونما کے اپنے غیر معمولی حالات میں جبکہ سرمایہ دارانہ ارتقا کے کئی مرحلے پھلانگے جا رہے ہوں اور دست نگر سرمایہ داری پختہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے تاریخی طور پر نارمل ارتقا کے وصف اور ضروری وقت سے بھی محروم ہو، اور تیزی سے زوال پذیر روائتی ڈھانچے بتدریج بدلتے ہوئے سرمائے کے بنیادی اجتماع کے عمل کا حصہ بن کر ساتھ ساتھ گھسٹ رہے ہوں۔ ریاست ہی ان غیر معمولی فریضوں کو سنبھالتی ہے۔ جو دست نگری کے ڈھانچے میں نجی سرمایہ دارانہ ڈھانچے کے بس میں نہیں ہوتے۔

دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ریاستی ساخت میں ریاستی ڈھانچہ ناظم نظام ڈھانچے کی حیثیت سے بنیادی سرمائے کے اجتماع و ارتکاز کو تیز کرنے اور مربوط کرنے کے لئے براہ راست معاشی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر معاشی طریقوں کو بروئے کار لاتا ہے تاکہ سرمایہ دارانہ معاشی عمل پذیری کا عمل غیر معاشی طریقوں کی جگہ لے سکے۔ ریاست ذرائع اجتماع اور زائد قدر کی تقسیم نو بڑھے ہوئے پیمانے پر سرمائے کی تجدید پیداوار اور سرمائے کے بنیادی اجتماع و ارتکاز کے حق میں کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ نجی سرمایہ دار شعبہ بھی

ریاستی سرپرستی، ریگولیٹڈ مارکیٹ میکنزم اور زائد قدر کی اس کے حق میں تقسیم لو سے وجود میں آتا ہے۔ اور آہنی تحفظات و پشت پناہی سے فروغ پاتا ہے۔ مادی اور سماجی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، معیشت کے بہت سے شعبوں کی بیک وقت تعمیر، مالیاتی نظام کی تشکیل، ذرائع رسل و رسائل و ابلاغ کی ترقی، زراعت کی جدید کاری اور ایسے طویل المدت منصوبوں، شعبوں اور صنعتوں کی تعمیر جن میں مستقل سرمائے کی شرح بہت زیادہ اور پیشگی سرمائے ADVANCED CAPITAL کا حجم کافی ہوتا ہے۔ ریاست ہی بطور انٹرپرائز کے یہ فریضے انجام دیتی ہے۔ نتیجتاً ریاستی ڈھانچہ کے ناظم نظام ڈھانچہ کے کردار کے باوصف ریاستی سرمایہ کاری کا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ مجموعی طور پر ریاست ناظم نظام مرکزی ڈھانچے کے طور پر ایک طرف دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کے مختلف حصوں شعبوں اور ڈھانچوں کو باہم مربوط کرتی ہے اور دوسری طرف ریاستی سرمایہ داری کا ڈھانچہ تشکیل دیتی ہے۔ جس کے گرد ریاستی اجارہ دار سرمایہ داری کے ابتدائی عناصر تشکیل پاتے ہیں۔ اس سرمایہ دارانہ ڈھانچہ کی اعلیٰ تشکیلی سطح اور طاقت و ریاستی ڈھانچہ کے حد سے بڑھے ہوئے کردار سے ریاستی سرمایہ داری کا ڈھانچہ مرکزی حیثیت کا حامل ہوجاتا ہے۔ اور اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوجاتا ہے۔ اندریں حالات سول اور ملٹری بیورو کریسی کے بالائی اور درمیانی حصوں میں سے نوکر شاہی بورژوازی پیدا ہوتی ہے جو معمول کی پیداواری سرگرمیوں سے وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ ریاستی ڈھانچے میں اپنے مقام اور اختیارات کے ناجائز استعمال اور لوٹ مار کے وسیع مواقع جنہوں نے منظم کرپٹ نظام کی صورت اختیار کرلی ہے اُسے بڑے پیمانے پر ابتدائی سرمائے ACCUMLATION OF PRIMITIVE CAPITAL جمع ہوتا ہے۔ لیکن جو ابھی سرمایہ نہیں بنتا تاکہ وہ سرمایہ کاری اختیار نہ کرے۔ جونہی یہ سرمایہ، تجارت (شراکتی کاروبار کمپنیوں اور فرمز کی تشکیل) غیر رسمی معیشت سے متعلق کاروبار و صنعت اور زمینی جائداد میں لگتا ہے۔ نوکر شاہی بورژوازی کا طبقہ وجود میں آجاتا ہے۔ اس طرح یہ نوکر شاہی بورژوازی گروہ نوکر شاہی بالعموم سے منفرد ہوتا ہے۔ اور یہ نوکر شاہی سرمایہ، ریاستی سرمایہ داری یا نام نہاد پبلک سیکٹر کے شعبہ سے اپنا علیحدہ وجود رکھتا ہے، لیکن یہ نوکر شاہی بورژوازی طبقہ اور ملٹری بیوروکریٹک اور لیگارشی کے مختلف گروہ پبلک سیکٹر کو (جو قانوناً تو ان کی ملکیت نہیں ہوتا) کو لوٹ مار کے بدترین طریقوں سے اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں، جو نتیجتاً ایک طرف نوکر شاہی سرمائے کو بڑھاتا ہے اور دوسری جانب ریاستی سرمایہ داری، پیداواری رشتے پر نوکر شاہی چھاپ کے باوصف نوکر شاہی ریاستی سرمایہ داری کی خصوصیات اختیار کرلیتی ہے۔ سول اور ملٹری بیورو

کریسی کی بالائی اور موثر درمیانی پرتوں نے پرائیویٹ سیکٹر کے مفت خورے پن و پسماندگی تجارت و خدمات کے شعبے کے بے پناہ پھیلاؤ قومی ذرائع پر اختیار اور دیہی و شہری زمینی جائیداد کی الائنس منفعیت بخش اسٹیٹ بزنس اور عالمی تجارت خاص طور پر درآمدات و بیرونی خریداری اور ٹھیکوں وغیرہ کے ذریعہ معاشرے میں دولت مند طبقوں میں منفرد مقام و حیثیت اختیار کرلی ہے، جن کے مفادات زمینی جائیداد کے ذریعہ زمیندار طبقوں، کاروبار کے ذریعہ تجارتی بورژوازی اور صنعت کے ذریعہ صنعتی بورژوازی سے جڑ گئے ہیں۔ اس طبقے کا ایک حصہ امپیریل سرمائے کے ساتھ مل کر گماشتہ بورژوازی میں بھی شامل ہوجاتا ہے۔ زائد قدر اور قومی ذرائع کی معاشی و غیر معاشی طریقوں سے سول و ملٹری بیورو کریسی کے حق میں بے پناہ تقسیم لوٹ سے نوکر شاہی بورژوازی اور اعلیٰ متوسط پرتوں میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے یہی وہ مفادات ہیں جو سول و ملٹری بیورو کریسی کے سیاسی اقتدار کے غلبے کا مادی موجب بنتے ہیں۔ اور جتنا یہ غلبہ بڑھتا ہے اتنے ہی یہ مفادات پھیلتے ہیں۔

ضیاء دور کی معاشی حکمت عملی اور معاشی بحران

ضیا کے دور میں جو حکمت عملی اپنائی گئی وہ ورلڈ بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ کی جانب سے قرضوں کی شرائط کے ساتھ مسلط کی گئی۔ عالمی مالیاتی اداروں کی شرائط قرضہ جات کی پشت پر نیوکلاسیکل انٹر نیشنل اکنامک تھیوری کارفرما ہے جس کی جڑیں تاریخی طور پر تقابلی فائدے کے نظریے میں ہیں۔ یہ پیداوار کو قومی حالات کی خصوصیات کے سیاق و سباق میں ترتیب دینے پر زور دیتا ہے۔ (کارل مارکس نے ایک عرصہ ہوا اس نظریہ کی پوری بنیاد کو اکھاڑ پھینکا تھا) پاکستان جیسے دست نگر اور پسماندہ ملک کے لئے اس نیوکلاسیکل انٹر نیشنل اکنامک تھیوری کے نظریہ کے اطلاق کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ غیر مساوی عالمی تقسیم محنت کے باعث پاکستان ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک نہیں اور عالمی قیمتوں پر صنعتی ترقی چونکہ مقابلتاً فائدہ مند نہیں اور قومی خصوصیت زرعی خام مال کی پیداوار یا ایسی صنعتی اشیاء جن کی بنیاد زراعت پر ہے لہٰذا ایک ایسا پیداواری ڈھانچہ مسلط کر دیا جاتا ہے جو زرعی پیداوار پر مبنی ہے۔ "آزاد منڈی کا میکنزم" اس غیر مساوی پیداواری ڈھانچے کے تسلط کو دو بالا کرتا ہے۔ ورلڈ بینک کی شرائط کے تحت اس نظریہ کو اپنا کر جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے نشو نما کا ایسا ماڈل اپنایا جو قطعی قومی نہیں بلکہ باہر سے مسلط کیا گیا تھا جس میں لمبے عرصے کے مفاد میں قومی معیشت کی منصوبہ بندی کو ترک کر دیا گیا۔

اس عشرہ میں جو حکمت عملی اپنائی گئی وہ چونکہ، ورلڈ بینک/عالمی مالیاتی فنڈ کے "اسٹرکچرل ردو بدل کے پروگرام" کے دائرے میں تھی۔ اس لئے اس عرصہ میں معاشی

لشو نما کی نہج اور سمت کا جائزہ، بہتر طور پر اسی کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ ورلڈ بینک /عالمی مالیاتی فنڈ کی پالیسی کے پانچ بنیادی نکات تھے اور ہیں:۔

۱۔ درآمدات کی چھوٹ

۲۔ امدادی رقوم کا خاتمہ

۳۔ سکے کی شرح تبادلہ میں کمی

۴۔ زرعی شعبے پر بنیادی زور اور پیش رفت

۵۔ تین ڈی (D) کی پالیسی اور پرائیویٹ سیکٹر کا بڑھا ہوا کردار۔

یہ رہنما اصول، دست نگری کی معیشت کی جدید لو آبادیاتی لشو نما میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور گہرے طور پر باہم مربوط ہیں اور انہیں اس پس منظر میں دیکھنا چاہیئے کہ متبادل درآمد صنعتی ترقی کی حکمت عملی IMPORT SUBSTITUTION INDUSTRIALIZATION STRATEGY کے تحت، پاکستان میں ریاستی سرپرستی میں تجارتی بندشوں TRADE TARRIFS قدر تبادلہ کی عالمی قیمتوں سے زیادہ شرح OVER VALUED EXCHANGE RATE، (تاکہ مقامی صنعت کو درآمد شدہ خام مال اور درمیانی اشیاء سستی مل سکیں) امدادی رقوم اور ریاست کی طرف سے مالیاتی پالیسیوں اور مارکیٹ میکنزم کا صنعتی سیکٹر کے حق میں وسیع استعمال کے ذریعہ صنعت کاری کو فروغ دیا گیا۔ اتنے بھاری تحفظات کے تحت صنعتی شعبہ وجود میں لایا گیا تھا۔ اب ان پالیسی شرائط کا تقاضہ تھا کہ ملکی منڈی کی بیرونی اشیاء کے لئے کھول دیا جائے "اور معاشی منصوبہ بندی میں ذرائع کی تقسیم نو اور تفویض، عالمی منڈی کی قیمتوں پر کی جائے۔ نتیجتاً ملک کا تقابلی فائدہ زرعی پیداوار کے شعبے میں ترقی سے منسلک کر دیا گیا ذیل میں ہم ان پالیسی شرائط کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

درآمدات کی چھوٹ کا مطلب ہے کہ ملکی منڈی کو کثیر القومی کارپوریشنز کی اشیاء کی کھپت کے لئے کھول دیا جائے۔ چونکہ مقامی صنعتی اشیا کی پیداوار کا بہت سا انحصار امدادی رقوم پر ہے۔ اور زیادہ شرح تبادلہ کے ذریعہ متبادل درآمد صنعتوں میں استعمال ہونے والی درآمد شدہ مشینری، خام مال اور درمیانی اشیاء سستی میسر آجاتی تھیں۔ اس لئے امدادی رقوم کے خاتمہ اور شرح تبادلہ میں کمی کے ذریعہ مقامی صنعتی اشیاء درآمد شدہ اشیاء کے مقابلے میں مہنگی ہو جائیں گی اور ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ درآمدات کی چھوٹ کی پالیسی اس امر کے باوجود اختیار کی جاتی تھی (اور کی گئی) کے ایک طرف پاکستان کے توازن ادائیگی پر گہرے منفی اثرات مرتب ہوں گے اور دوسری جانب مقامی متبادل درآمد صنعت نہ صرف ان درآمد شدہ اشیاء کا مقابلہ نہ کر پائیں گی۔ بلکہ شرح

تبادلہ میں کمی کے نتیجہ میں ان صنعتوں میں استعمال ہونے والے درآمد شدہ خام مال اور درمیانی اشیاء کی مہنگی دستیابی سے مقامی صنعتی پیداوار عالمی قیمتوں پر غیر منفعت بخش ہو جائیں گی۔ سرکاری سطح پر بھی اس مشکل کا اعتراف یوں کیا گیا ہے۔ "اس امر کے باوجود کہ پاکستان کی زر مبادلہ کی آمدنیاں اس کی درآمدات کا خرچ اٹھانے کے لئے ناکافی ہیں پاکستان ایک آزاد منش درآمدی پالیسی پر اس اعتقاد سے عمل پیرا ہے کہ زیادہ آزاد تجارت عوام کی بہبود کو بڑھاتی ہے۔"

اس پالیسی کے تحت، چونکہ سرمایہ دارانہ نشو نما کا پیمانہ عالمی پیمانے PARAMETERS اور قیمتوں نے متعین ہوتا ہے اور عالمی سرمایہ داری میں دست نگری کے رشتوں کے باوصف، تقسیم محنت میں پاکستان کی پوزیشن بہت کم تر ہے اور قومی صنعت، ہنوز کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے۔ لہٰذا "تقابلی فائدے" کا تقاضہ ہوا کہ اس شعبہ معیشت پر زور دیا جائے جو پسماندگی کے حسب حال ہے، اور وہ ہے زرعی شعبہ جو نہ صرف معیشت کی بنیاد ہے بلکہ زر مبادلہ کے حصول کا زیادہ تر دارومدار بھی زرعی اشیاء یا زرعی خام مال پر مبنی صنعتی اشیاء پر ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اس وقت صنعتی پیداوار نصف اور برآمدات کا ۸۰% زرعی بنیاد کا حامل ہے۔ اسی پالیسی کے نتیجہ میں قرضوں ادائیگی اور زر مبادلہ کی ضروریات زرعی برآمدات کے وقتی طور پر بڑھنے سے پوری کی جا سکیں گی۔ لیکن زرعی اشیاء کی پیداوار کا موسمی حالات پر انحصار، زرعی پیداوار کی نشو نما کی مادی حدود عالمی منڈی میں زرعی اجناس و اشیاء کی کم ہوتی ہوئی قیمتیں اور تجارت کا شرائط کا کم ہونا اور تجارتی پابندیوں TARIFFS کا بڑھتا ہوا رجحان زرعی برآمدات کے ذریعہ زر مبادلہ کے حصول کو بے یقینی بنا دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک فصل کی خرابی کے نتیجہ میں پوری معیشت ہل کر رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ہوا۔ ایسی ناقابل انحصار بنیاد پر نشو نما کا مطلب ہے کہ قومی معیشت مطلق طور پر بیرونی قرضوں کے دام میں پھنسی رہے۔

ورلڈ بینک/عالمی مالیاتی فنڈ کی شرائط قرض کے مطابق، "اسٹرکچرل ردو بدل کے پروگرام" پر شدومد سے عمل درآمد چھٹے پنجسالہ منصوبے کے آغاز پر کیا گیا۔ جس میں صنعت کے بجائے زراعت کو معاشی نشو نما کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے۔ "منصوبے کی نشو نما کی حکمت عملی کی بنیاد زرعی پیداوار میں بڑی پیش رفت پر رکھی گئی ہے۔ ایسا "تقابلی فائدے" کی بنیاد پر ذرائع کی تقسیم کے نکتہ نظر سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا ورلڈ بینک کی جانب سے چھٹے پنجسالہ منصوبے کے ریویو میں کہا گیا ہے۔ "منصوبے کے بنیادی مقاصد میں زراعت میں ایک بڑی پیش رفت حاصل کرنا، برآمدی منڈیوں میں

زرعی پیداوار کے لئے بڑھا ہوا مقام، ایسی منتخب صنعتوں میں تیز ترقی جن میں ملک کو تقابلی افادہ حاصل ہو شامل ہیں۔"

منفی نشوونما پر منفی اثرات

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں درآمدات کی چھوٹ، شرح تبادلہ میں کمی امدادی رقوم کے خاتمے کے ساتھ ساتھ معیشت میں پرائیویٹ سیکٹر کے بڑھتے ہوئے کردار کو تسلیم کیا گیا۔ اور ریاستی سیکٹر میں سرمایہ کاری کو کم کرنے کی واضح پالیسی اختیار کی گئی۔ ورلڈ بینک کے اسی ریویو میں کہا گیا۔ "منصوبے کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے۔ کہ پرائیویٹ سیکٹر کو بڑھا ہوا کردار سونپا گیا۔ ریاستی سرمایہ کاری کے مقابلہ میں نجی سرمایہ کاری کو اس سے دوگنا بڑھنا تھا۔ صنعت میں پبلک سیکٹر کی شمولیت کو تیزی سے کم کرنا تھا۔ منصوبے کے مجموعی اہداف کے حصول کا دارومدار ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ حد تک پرائیویٹ سیکٹر کی کارکردگی پر رکھا گیا ہے جیسا کہ منصوبے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ قیمتوں کے تعین میں بڑے اقدامات DEREGULATION تجارتی پابندیوں TARIFFS اور درآمدی چھوٹ اور دوسری ترغیبات کی ضرورت ہوگی تاکہ پرائیویٹ سیکٹر وہ بڑھا ہوا کردار ادا کر سکے جس کی کہ اس سے توقع ہے۔ لہٰذا پبلک سیکٹر میں صنعتی نشو نما کے لئے سرمایہ کاری کو کم کر دیا گیا اور پرائیویٹ سیکٹر سے توقعات یہ وابستہ کی گئیں کہ اس کی سرمایہ کاری پبلک سیکٹر کے مقابلہ میں دوگنی بڑھے گی۔ لیکن یہ توقعات پوری نہ ہوئیں۔ ایک طرف تو پرائیویٹ سیکٹر جو متبادل درآمد صنعتی حکمت عملی کے زبردست تحفظات کے تحت وجود میں آیا تھا۔ آزادانہ درآمدات کی پالیسی امدادی رقوم میں کمی اور شرح تبادلہ میں کمی کی پالیسی کے بموجب، عالمی قیمتوں پر سرمایہ کاری کرنے سے گریز پر رہا اور دوسری جانب برآمدی رخ والی صنعت EXPORT ORIENTED INDUSTRY عالمی قیمتوں اور مقابلے کے حالات میں زیادہ فروغ نہیں پا سکتی تھی۔ چنانچہ پرائیویٹ سیکٹر کے مخصوص کردار کے بموجب اس نے سرکولیشن کے میدان ہی کو زیادہ منفعت بخش جانا۔ باوجودیکہ پرائیویٹ سیکٹر کی سرمایہ کاری بعض "تقابلی فائدے والی" برآمدی رخ کی صنعتوں میں بڑھی لیکن یہ توقعات سے بہت کم رہی جبکہ پبلک سیکٹر میں صنعتی سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کی پالیسی کے بموجب سرمایہ کاری سے اجتناب کیا گیا۔ پھر بھی ریاستی سیکٹر میں سرمایہ کاری پرائیویٹ سیکٹر سے زیادہ رہی حالانکہ یہ پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی نتیجتاً مجموعی صنعتی پیداوار کم ہو گئی جس کی بنیادی وجوہات ریاستی

سیکٹر میں سرمایہ کاری سے اجتناب اور عالمی قیمتوں پر ذرائع کی تقابلی فائدے کے مطابق تقسیم نو اور ایلو کیشن اور گردشی سرمائے کے زیادہ منفعت بخش میدان کے ناطے بورژوازی کا مفت خورہ پن کا کردار ہے۔ نتیجہ یہ برآمد ہو کہ مجموعی داخلی سرمایہ کاری میں کمی کا رجحان پیدا ہوا۔ اور یہ ۵٫۸ (۷۷/۱۹۷۶ء) سے کم ہو کر ۳٫۴ فیصد (۸۴/۱۹۸۳ء) رہ گئی۔ مجموعی قومی پیداوار GNP میں مجموعی متعین سرمایہ کاری کا حصہ ۷۷/۱۹۷۶ء کے مقابلہ میں ۱۷٫۶ سے کم ہو کر ۸۴/۱۹۸۳ء میں ۱۳٫۹ فیصد رہ گیا۔ اور ۸۶/۱۹۸۵ء میں ۱۶٫۵ فیصد ہو کر بھی اس سے کم رہا کیونکہ پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری اس پالیسی کے تحت کم کر دی گئی تھی۔

اور یہ مجموعی قومی پیداوار کے ۱۲ فیصد سے کم ہو کر ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۸٫۶ رہ گئی۔ جبکہ نجی سیکٹر میں سرمایہ کاری ۷۷-۷۶ء سے ۸۴/۸۳ء کے سالوں میں ۵ فیصد رہی اور ۸۶/۸۵ء میں ۶ فیصد ہو گئی۔ صنعتی شعبہ کی مجموعی نشو نما ۸۶-۸۲ کے سالوں میں ۷٫۷ فیصد رہی اور اس چھوٹے پیمانے کی صنعت کا حصہ ۹٫۴ تھا۔ جبکہ بڑے پیمانے کی صنعت کا حصہ اس سے بہت کم یعنی ۷٫۴ فیصد رہا۔ نشو نما کی یہ شرح ۸۲/۷۷ کے سالوں کی شرح سے بہت کم تھی یعنی کل ۱۰٫۶ فیصد اور اس میں بڑی صنعت کا حصہ ۱۱٫۴ فیصد تھا۔ یہ نشو نما گذشتہ دور (بھٹو پیریڈ) کے لمبے عرصے میں مکمل ہونے والی صنعتی منصوبوں کی مرہون منت تھی۔ ورلڈ بینک کی پالیسی پر عملدرآمد کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تجارت و خدمات کے شعبوں میں پھیلاؤ آیا اور ۴۰٫۹ فیصد (۷۸-۷۷ء) سے بڑھ کر ۴۲٫۴ فیصد (۸۵-۸۴ء) ہو گیا اور اس کے مقابلے میں اشیائے تجارت کی پیداوار کا حصہ ۵۰٫۷ فیصد سے کم ہو کر ۴۹٫۶ فیصد رہ گیا۔ چونکہ صنعتی شعبوں میں نشو و نما مخصوص صنعتوں تک محدود رہی تھی، خوراک اور ٹیکسٹائلز ابھی بھی صنعتی شعبے میں اضافہ شدہ قدر کے نصف کی ذمہ دار تھیں۔ علاوہ ازیں صنعتی شعبہ میں اضافہ شدہ قدر کا دو تہائی ریاستی تحفظات کا مرہون منت رہا تھا۔ لہٰذا ۱۹۸۴ء میں نئی صنعتی پالیسی کے تحت زیادہ اضافی قدر پیدا کرنے والی صنعتوں (کیمیکل اور انجینئرنگ اشیاء) اور برآمدی رخ والی صنعتوں پر زور دیا گیا تاکہ صنعتی شعبہ کو زیادہ متفرق بنایا جاسکے اور مجموعی طور پر صنعتی پیداوار کو برآمدات کے مقابلے میں زیادہ مؤثر بنایا جاسکے۔ لیکن جیسا کہ پہلے زیر بحث آچکا ہے۔ "ورلڈ بینک پالیسی شرائط کے تحت ایسا ممکن نہ ہو سکا۔" اور ماسوا نائٹرو جینس کھاد اور MS اشیاء کی پیداوار کے، خوراک اور ٹیکسٹائل کا شعبہ ہی پیداوار پر حاوی رہا۔ دریں اثناء عالمی سرمائے کی سرمایہ کاری میں کافی اضافہ ہوا ہے اور یہ جولائی سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۱۵۹۴ ملین روپے ہو گیا ہے۔ جبکہ صنعتی شعبہ میں نئی سرمایہ کاری کا حصہ ۵۰ فیصد ۸۳-۷۸ء

سے کم ہو کر ۳۰ فیصد ۸۶-۸۳ رہ گیا۔

شرح تبادلہ میں کمی

ورلڈ بینک شرائط میں سے ایک اہم شرط شرح تبادلہ میں کمی تھی۔ ۸/جنوری ۱۹۸۲ء سے قبل روپیہ ۹۶۹۰ روپے فی ڈالر کی شرح پر ڈالر سے منسلک تھا۔ روپے کا ڈالر سے متعین تعلق ختم کر کے اسے دوسرے تجارتی حصہ داروں کی کرنسیوں کے مقابلے میں کھلا چھوڑ دیا گیا۔ جبکہ ڈالر سے بدستور بطور مرکز کرنسی کا رشتہ برقرار رہا۔

یوں سکے کی شرح تبادلہ ڈالر کے مقابلے میں ۲۶۸۴ فیصد (مارچ ۱۹۸۷ء) تک کم ہو گئی۔ جبکہ جاپانی ین کے مقابلے میں حقیقی معنوں میں یہ کمی ۶۲۶ فیصد تھی۔ شرح تبادلہ میں اس کمی کے براہ راست تین اثرات مرتب ہوئے۔ مستقل سرمائے کی قیمت میں اضافہ کے باعث اور متبادل درآمد صنعتوں میں استعمال ہونے والے خام مال اور درمیانی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ سے درآمد شدہ خام مال اور درمیانی اشیاء استعمال کرنے والی "مقامی" صنعت کی اشیاء کی قیمتوں میں درآمد شدہ اشیاء کے مقابلہ میں اضافہ ہوا ہے۔ برآمدات کا حجم بڑھنے کے باوجود ان کی قدر تبادلہ کم ہو گئی۔ جبکہ درآمدات مہنگی ہو گئیں۔ نتیجتاً توازن ادائیگی بگڑتا چلا گیا ہے۔ قدر تبادلہ میں یہ کمی توازن و ادائیگی پر پڑنے والے دباؤ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئے آزاد منش تجارت، امدادی رقوم کے خاتمے اور کمی اور غیر مساوی تجارت کے باعث شرائط تجارت میں کمی واقع ہوئی۔ جو ۸۵۶۷ فیصد (۷۹-۷۸ء) سے کم ہو کر ۷۰ فیصد (۸۴-۸۳ء) رہ گئیں۔ یعنی "سستا بیچو اور مہنگا خریدو" جدید نوآبادیاتی سرمایے کے اہم اصول کے طور پر زیادہ کار فرما ہو گیا ہے۔ جو عالمی سرمائے پر انحصار کو نتیجتاً اور بڑھاتا ہے۔ نیز برآمدات سے بڑھنے کی جو اعلیٰ توقعات وابستہ کی گئیں تھیں وہ غلط ثابت ہوئی ہیں۔ اور چھٹے پنجسالہ منصوبے میں ۱۵ فیصد کے ہدف سے بہت کم ثابت ہوئی۔ اور صرف ۴ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھیں۔ اس معمولی اضافے میں بھی چاول اور کپاس و ٹیکسٹائل کی برآمدات نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ تجارتی خسارہ جو کافی بڑھتا چلا گیا ہے اس کا فوری منفی اثر اس لئے مرتب نہیں ہوا کہ عالمی منڈی میں تیل، خوردنی تیل کی قیمتوں میں کمی واقع ہوئی اور توازن ادائیگی جو ہر سال بگڑتا جا رہا ہے گو بیرون ملک گئے پاکستانیوں کی بھیجی ہوئی رقم نے زر مبادلہ کی آمدنی پر پڑنے والے دباؤ کو کم رکھا ہے۔ جو ۵۱۴۷۴ ملین ڈالر سالانہ (۷۷-۷۶ء) سے پانچ گنا بڑھ کر ۲۸۸۵۶۵۰ ملین ڈالر (۸۳-۸۲ء) ہو گئیں۔ لیکن گزشتہ سالوں میں زر مبادلہ کے اس ذریعہ میں اوسط ۷۵۶۵ فیصد کے حساب سے جو اضافہ ہو رہا تھا۔ گزشتہ چار پانچ سالوں سے اس میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ۸۴-۸۳ء میں کمی ۱۵۱ فیصد ۸۵-۸۴ میں ۷ ۶۲۰ فیصد

اور ۸۷-۱۹۸۶ء کے پہلے نو ماہ میں ۱۲٫۴ فیصد کمی واقع ہوئی۔ زر مبادلہ کے اس بڑے ذریعہ میں کمی سے نہ صرف یہ کہ زر مبادلہ کا بڑا ذریعہ رفتہ رفتہ سکڑتا جائے گا۔ جبکہ توازن ادائیگی پر اس کے جو منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں بیرونی قرضوں اور عالمی سرمائے کی دست نگری میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا جائے گا۔ چونکہ، اس وقت وصول شدہ نئے قرضہ جات کا تقریباً ۸۰ فی صد سابقہ قرضہ جات کی ادائیگی میں واپس ہو جاتا ہے۔ لہٰذا دست نگری کا گمبیر چکر اور مضبوط ہوگا۔ نتیجتاً دست نگر سرمایہ دارانہ نشو نما کے منفی مضمرات کی سماجی نشو نما پر روک اور بڑھتی جائے گی۔ اور جدید نوآبادیاتی سرمائے کا اجتماع، عالمی سرمائے کے اجتماع میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کا موجب بنے گا۔

زرعی شعبہ

باوجودیکہ زراعت پر بنیادی زور دیا گیا، زرعی پیداوار کی نشو نما گزشتہ تین چار سال میں ۵٫۹ فیصد رہی ہے۔ اور گزشتہ دس برسوں میں مجموعی داخلی پیداوار GDP میں زراعت کا حصہ ۳۲ فیصد سے کم ہو کر ۲۵ فیصد رہ گیا ہے۔ زراعت میں نشو نما کی یہ شرح چھٹے پنجسالہ منصوبے کے ہدف اور پانچویں پنجسالہ منصوبے کی شرح سے کم رہی ہے۔ ضیاء حکومت نے زمیندار طبقوں کے مفادات میں ۱۹۷۷ء کی زرعی اصلاحات پر نہ صرف یہ کہ عملدرآمد نہیں کیا۔ بلکہ ان میں بہت سی ترامیم کر کے انہیں بالکل ہی غیر مؤثر کر دیا۔ (حالانکہ یہ کوئی ایسی زوردار اصلاحات بھی نہ تھیں) نیز ۱۹۷۷ء کا فنانس ایکٹ، جس نے مالیہ (لینڈ ریوینیو) کی جگہ زرعی آمدنیوں کی بنیاد پر ٹیکس کا اجراء کرنا تھا مارشل لاء کے نفاذ کے بعد لاگو نہ کیا گیا۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں زراعت کو معیشت کی بنیاد بنائے جانے سے زراعت میں پبلک سرمایہ کاری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ زرعی ترقیاتی بینکوں، کوآپریٹیوز اور تقاوی قرضوں کی کل مالیت ۱۷۱۶ ملین روپے (۷۷-۱۹۷۱) سے بڑھ کر ۱۲٫۶۸۰ ملین روپے (۸۶-۱۹۸۵) ہو گئی۔ جبکہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں قرضہ جات کا اندازہ ۱۵٫۴۳۰ ملین روپے لگایا گیا۔ یعنی کوئی دس گنا اضافہ ہوا۔ بلاسود قرضہ جات میں اضافہ اس سے زیادہ شرح سے ہوا۔ اور یہ بڑھ کر ۶٫۷۵۳۴ ملین روپے (۸۶-۱۹۸۵) ہو گئے۔ ریاست کی زراعت میں سرمایہ کاری فقط قرضوں کے اس بڑے پیمانے پر فراہمی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ زرعی استعمال کے اشیاء پر امدادی رقوم بھی بڑھا دی گئیں۔ کیونکہ سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ ان اشیاء کا استعمال بھی بڑھ گیا تھا۔ مثلاً کھاد پر امدادی رقوم ۶۰ ملین روپے (۷۶-۱۹۷۵) سے بڑھ کر ۲۴۴۸ ملین روپے (۸۶-۱۹۸۵) ہو گئیں۔ زراعت کی مشین کاری اور سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی کو اس دور میں مزید فروغ ملا۔ کیونکہ حکومت،

زرعی سرمایہ داری بالخصوص بڑے سرمایہ دارانہ فارمز کی ترقی میں گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ باوجودیکہ ٹریکٹرز کی مختلف قسموں کی سالانہ پیداوار ۱۲۰۰۰ ہو گئی۔ ان کی درآمد بڑے پیمانے پر جاری رہی۔ ۸۳-۷۳ء کے سالوں میں ۴۷ کے مقابلے میں ٹریکٹروں میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ اسی طرح مصنوعی کھاد کا استعمال بھی، پانی کی سہولیات میں اضافے سے (جہاں ٹیوب ویل ہیں) بڑھا اور یہ ۶۲ کلو گرام (۸۳-۸۲ء) فی ہیکٹر سے ۷۵ کلو گرام فی ہیکٹر (۸۶-۸۵ء) تک بڑھ گئی۔ کیونکہ زیادہ پیداواری بیجوں کے لئے کھاد اور پانی کا زیادہ استعمال ہی زیادہ پیداوار کا باعث بنتا ہے۔

معاشی زائد کی زرعی شعبے میں تقسیم نو کا عمل اس حکمت عملی میں جاری رہا۔ بڑی فصلوں کی امدادی قیمتیں بڑھائی جاتی رہیں۔ اور شرائط تجارت، زراعت کے حق میں خاص طور پر بڑے زمینداروں اور سرمایہ دار کاشت کاروں کے حق میں رہیں۔ بڑی فصلوں کی قیمت خرید کا تناسب ان فصلوں کی عالمی قیمتوں کے مقابلے میں بہتر ہوا ہے۔ امدادی رقوم میں اب کمی کرنے کے باوجود شرائط تجارت، خواہ اس کی پیمائش مقدار پیداوار میں اضافے سے ہوتی ہے۔ (ماسوائے گنے کے) اس کی ایک بنیادی وجہ بڑی فصلوں کی قیمت خرید میں اضافہ ہے۔ مزید برآں یہ کہ زراعت میں سبز انقلاب کی دوہری حکمت عملی سے جو سائز اور کار کردگی کے درمیان تعلق کے ناطے بڑے زمینداروں کے سرمایہ دار فارموں کے حق میں ہو گیا ہے۔ مشینی کاشت کے بڑے کھیتوں کی پیداوار، بٹائی پر کاشت کرنے والے کھیتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے ان میں بٹائی پر دی ہوئی زمین واپس لینے کا رجحان بہت تیز ہو گیا۔ جبکہ خاندانی کاشتکاری کے نظام (خود کفیل کسان معیشت) کا بحران بڑھ گیا۔ بے زمینی اور کم زمینی میں بھی آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ کم زمینی کا اظہار ۷،۵ ایکڑ تک کے فارموں میں کافی اضافہ سے ہوتا ہے۔ نیز بیدخل کسانوں، بے روزگاروں، نیم مزدوروں اور کھیت مزدوروں کی تعداد میں اضافہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اس دہائی ۷۸/۱۹۷۷ء تا ۸۸/۱۹۸۷ء میں گماشتہ معاشی منیجروں نے ورلڈ بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ کے زیر سرپرستی دست نگر معیشت کو فوری مدت کے نکتہ نظر سے روز مرہ بنیادوں پر چلایا کہ ایک طرف مفت خور ریاست کے بڑھتے ہوئے غیر پیداواری بھاری مصارف پورے ہو سکیں، خاص طور پر فرنٹ لائن اسٹیٹ کی فوجی مشین کو سنٹرل کمانڈ کے خطے میں اسٹریٹجک عزائم سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ استحصالی طبقوں کے مابین زائد قدر کی زیادہ سے زیادہ تقسیم نو میں بہتر توازن قائم رکھا جا سکے اور سماجی سطح پر معاشرتی کشاکش کو ٹالا جا سکے، سب سے بڑھ کر دست نگر معیشت کو جدید نو آبادیاتی رشتوں اور

عالمی سرمائے کی شرائط کے مفاد کے تابع کرتے ہوئے لمبی مدت کے نکتہ نظر سے قومی معیشت کی "حقیقی و قومی" نشوونما کو تج دیا گیا۔

چونکہ دوررس نکتہ نظر سے قومی معیشت کی مضبوط اور ٹھوس نشوونما ان کا درد سر نہ تھا۔ لہٰذا گماشتہ منفعت خور اور کوتاہ اندیش آمریت نے بہت سے موافق اندرونی و بیرونی معاشی عوامل کو فوری مدت کے خود غرضانہ مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس کی ملمع سازی کے لیے ماہرین فن اعداد شماری (ECONOMETRY) نے تو کمال ہی کر دکھایا کہ دست نگری کی حکمت عملی کے کارن ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۸ء کے سالوں میں مجموعی داخلی پیداوار (GDP) کی اوسط سالانہ شرح نشوونما ۶٫۷ فی صد رہی جبکہ ۱۹۸۶/۸۷ء میں نشوونما کا اندازہ سات فی صد تک لگایا گیا تھا۔ اس سے قبل کے ۲۵ سالوں میں یہ ۵۵ فی صد رہی تھی۔ یہاں یہ دکھا دینا ضروری ہے کہ پاکستان میں چند دیگر ممالک کی طرح قومی آمدنی کے حسابات میں بیرون ملک سے ورکرز کی بھیجی ہوئی رقوم کو علیحدہ طور پر شامل کر لیا جاتا ہے اور چونکہ ان سالوں میں اس مد میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا لہٰذا اہم معاشی اعشاریوں (INDICATORS) پر اس نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ مجموعی داخلی پیداوار کی اس نشوونما میں یقیناً بہت سے موافق اندرونی و بیرونی عوامل کارفرما تھے۔

(۱) ضیاء کے دور میں وہ طویل المدتی منصوبے (LONG GESTATION PROJECTS) جن میں پیشگی سرمائے اور مستقل سرمائے کی شرح بہت زیادہ تھی مثلاً (اسٹیل ملز) پھل لائے۔ جس سے سرمائے کی شرح (CAPITAL OUTPUT RATIO) یعنی ۵٫۴۵ (۱۹۷۰ء ۱۹۷۷ء) سے کم ہو کر پانچویں اور چھٹے منصوبے میں ۴٫۴۱ فی صد رہ گئی۔

(۲) مشرق وسطیٰ سے محنت کشوں و دیگر پاکستانیوں کی بھیجی ہوئی ریکارڈ رقوم (REMITTANCES) سے ایک طرف زرمبادلہ کی ضرورتیں پوری ہوئیں اور توازن ادائیگی کا دباؤ کم ہوا اور دوسری طرف گھریلو منڈی میں روپے کی صورت میں وافر ذرائع میسر آ گئے جس سے صنعتی خام مال، درمیانی اشیا و دیگر درآمدات آسان ہو گئیں اور چھوٹے پیمانے کی صنعت، تجارت، تعمیرات و خدمات کے شعبوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مزید برآں بے روزگاری کا دباؤ کم ہوا اور افراط زر کا آبادی کے اچھے حصے پر دباؤ کم ہو گیا اور معاشرے میں ایک مستحکم صارف نے منڈی کی چہل پہل کو دوبالا کیا۔

(۳) انقلاب افغانستان کے خلاف امریکی سامراج اور دنیا بھر کے رجعت پسندوں کی جنگ سے وافر قرضہ جات اور عطیات میسر آئے اور سامراج کے ساتھ اسٹریٹجک رشتوں کی متحرک بحالی سے پاکستان کے لیے امداد کے کنسورشیم، رجعتی عرب حکومتوں اور عالمی مالیاتی اداروں کے لئے پاکستان نے ایک ترجیحی آسامی FAVOURED CLIENT کی حیثیت

سے لی۔

(۴) سماجی و مادی بنیادی ڈھانچے کی دیکھ بھال اور ترقی، جو معاشی نشوونما کے لیے لازمی شرط ہے، کو مجرمانہ طور پر نظر انداز کر دیا گیا اور یوں ترقیاتی منصوبوں کی کٹوتی سے جو وافر ذرائع ہاتھ آئے وہ غیر پیداواری شعبوں کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے کام آئے۔

(۵) کالے دھن، خاص طور پر ہیروئن کے کاروبار اور اسمگلنگ سے دولت کے بے پناہ ذرائع کو ملکی معیشت میں گہرا عمل دخل حاصل ہو گیا اور یہ رسمی معیشت کے مقابلے میں کہیں زیادہ شرح سے نشوونما پا رہی ہے۔ نیشنل ٹیکسیشن ریفارمز کمیشن کے مطابق کالا دھن یا غیر رسمی معیشت مجموعی داخلی پیداوار کے ایک تہائی یعنی دس ارب ڈالر اور دوسرے ذرائع کے مطابق یہ سولہ ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ غالباً یہ اندازے بھی پورے طور پر غیر رسمی معیشت کا احاطہ نہیں کر پائے۔ ڈاکٹر محبوب الحق کے مطابق سالانہ سرکاری خورد برد، ٹیکس چوری، دیگر ناجائز ذرائع سے تقریباً ۱۲۰ ارب روپے کی ہیرا پھیری کی جاتی ہے۔

(۶) ماسوائے ایک دو برسوں کے، زرعی پیداوار کے لیے موسم خوش گوار رہا۔ اشیائے پیداوار خاص طور پر کھاد کے بہتر استعمال اور زرعی پیداوار کی بہتر قیمتوں کی ترغیبات سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا جس سے زرعی بنیاد کی حامل برآمدات خاص طور پر کپاس کی برآمد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

(۷) گزشتہ برسوں میں خوردنی اور خام تیل کی عالمی قیمتوں میں کمی کے باعث اس مد پر درآمدی اخراجات میں کمی رہی جس سے نہ صرف زرمبادلہ کی بچت ہوئی۔ بلکہ تجارتی خسارہ بھی زیادہ بگڑنے سے بچ گیا۔

یہ وہ اندرونی و بیرونی معاشی عوامل تھے۔ جن سے ضیا دور میں معاشی نشوونما کی اعلیٰ شرح کے خوش کن دعوے کئے جاتے رہے اور ہمارے سرکاری معیشت دان جلد ہی کوریا کے "معجزے" کو پاکستان میں دہرائے جانے کی نوید دیتے تھے۔ حکومتی بلند بانگ دعوؤں اور ورلڈ بینک کی سابقہ پیش بینی سے قطع نظر یہ جاننے کے لیے کہ بورژوا معیشت کی اہم پیمانوں پر صحت کیسی ہے؟ کیا نشوونما کے دعوے حقیقی ہیں اور اگر نہیں تو حقیقت کیا ہے؟ سماجی و معاشی بنیادی ڈھانچوں طبقاتی و قومیتی، انسانی و ماحولیاتی اور دور رس نکتہ نظر سے معیشت کی دگرگوں حالت کے کیا مضمرات ہیں؟ معاشی بحران کی مخصوص صورت حال اور اس کے حال و مستقبل پر پڑنے والے اثرات کیا ہوں گے؟

بورژوا پیمانوں پر جائزہ

(۱) اعلیٰ شرح نشوونما کی خوش نما تصویر پیش کرتے وقت اس اہم بنیاد کو چھپا لیا جاتا ہے کہ نشوونما معیشت کے کون سے شعبوں کی مرہون منت ہے۔ اس کی بنیاد پیداواری ہے یا غیر پیداواری اور وہ ٹھوس و حقیقی ہے یا پھر محض ثانوی اور وقتی نوعیت کی ہے۔ حقائق کھنگالنے سے جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء کی پیداوار کے شعبوں کا مجموعی داخلی پیداوار میں حصہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ جب کہ خدمات و تجارت اور غیر پیداواری شعبوں کا حصہ بتدریج بڑھ رہا ہے۔ اشیاء کے پیداوار کے شعبوں کا حصہ (جن میں زرعی و صنعتی پیداوار بجلی اور گیس بھی شامل ہیں) ۵۰٫۷ فی صد (۱۹۷۷/۷۸ء) سے کم ہو کر ۴۹٫۶ فی صد (۱۹۸۵/۸۶ء) رہ گیا ہے اور خدمات کے شعبوں (جن میں تجارت بینکنگ، انشورنس، انتظامیہ، دفاع، ٹرانسپورٹ، سیوریج، مواصلات اور دیگر خدمات شامل ہیں) کا حصہ ۴۰٫۹ فی صد سے بڑھ کر ۴۴٫۲ فی صد ہو گیا ہے یہ رجحان اور بھی منفی طور پر ابھر کر سامنے آتا اگر بھٹو دور کے طویل المدتی منصوبے ضیاء آمریت کے ابتدائی چار پانچ سالوں میں تکمیل کو نہ پہنچتے۔ ورلڈ بینک/عالمی مالیاتی فنڈز کے اداراتی ردو بدل کے پروگرام کے تحت ۱۹۸۰ء کے بعد سے پبلک سیکٹر میں سرمایہ کاری کو تیزی سے کم کر دیا گیا۔ جبکہ پرائیویٹ سیکٹر میں سرمایہ کاری بڑھنے کے باوجود توقع سے کہیں زیادہ کم رہی۔ نتیجتاً ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء کے سالوں میں صنعتی نشوونما جو ۱۰٫۶ فی صد تھی جس میں بڑے پیمانے کی صنعت کا حصہ ۱۱٫۴ فی صد تھا، نئی حکمت عملی کے تحت مجموعی صنعتی نشوونما ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۶ء کے سالوں میں کم ہو کر ۷٫۹ رہی اور اس میں چھوٹے پیمانے کی نشوونما کی شرح ۹٫۴ فی صد اور بڑے پیمانے کی صنعتی نشوونما کم ہو کر ۷٫۴ فی صد رہ گئی۔ تجارت و خدمات یعنی گردشِ زر کے میدان کی وسعت نے غیر پیداواری شعبوں کو اور بھی مہمیز لگائی۔

(۲) معیشت کی حقیقی صحت کے رخ کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقی قیمتوں پر مجموعی قومی داخلی پیداوار میں متعین سرمایہ کاری کی شرح کا اندازہ لگایا جائے جبکہ ہمارے ماہرین اعداد و شمار اسے موجودہ قیمتوں پر بڑھا چڑھا کر پیش کر کے حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ گذشتہ بارہ برسوں میں مجموعی قومی پیداوار نے متعین سرمایہ کاری اور اس کی حقیقی شرح میں کمی کا رجحان نمایاں ہے۔ اس کی چار اہم وجوہات ہیں۔

اوّل:۔ ورلڈ بینک اور حکومت کی پالیسی کہ پبلک سیکٹر میں سرمایہ کاری کم کی جائے۔ صنعتی شعبے میں ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۳ء کے سالوں میں ریاستی سرمایہ کاری جو کل صنعتی سرمایہ کاری کا پچاس فی صد تھی ۱۹۸۳-۱۹۸۶ء کے سالوں میں کم ہو کر تیس فی صد رہ گئی۔

دوم:۔ ورلڈ بینک عالمی مالیاتی فنڈ کی شرائط قرضہ جات کے تحت عالمی قیمتوں اور پیمانوں پر بڑے صنعتی شعبے میں سرمایہ کاری میں کمی لازمی تھی۔

سوم:۔ مستقل سرمائے اور پیشگی سرمائے کی اعلیٰ شرح اور ہماری صنعتی بورژوازی کا مفت خورہ پن اسے تجارت اور سرکولیشن کے میدان کی طرف راغب کرتا ہے اور وہ چٹکیوں میں نفع بٹورنے کا رجحان رکھتی ہے۔

چہارم:۔ ریاست کے غیر پیداواری شعبوں کا بوجھ معیشت پر بے حد و حساب بڑھا ہے لہٰذا مجموعی قومی پیداوار (GNP) میں متعین سرمایہ کاری کا حصہ ۱۶ء۷ فی صد (۱۹۷۷/۷۸ء) سے کم ہو کر ۱۵ء۳ فی صد (۱۹۸۵/۸۶ء) رہ گیا ہے درحقیقت دو تہائی سرمایہ کاری اندرونی و بیرونی قرضوں اور ورکرز کی بھیجی ہوئی رقوم پر مشتمل ہے۔ جبکہ کم آمدنی اور درمیانی آمدنی والے ممالک میں یہ بالترتیب ۲۵ فی صد اور ۲۱ فی صد ہے۔

(۳) سرمایہ کاری اور نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ بچتوں کی شرح مجموعی داخلی اور قومی پیداوار میں کتنی ہے۔ مجموعی داخلی پیداوار میں مجموعی داخلی بچتوں (GDS) کی شرح میں کمی کا واضح رجحان نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء کے سالوں میں یہ ۱۱ء۴ فی صد تھی جبکہ ۱۹۷۷/۷۸ء کے سالوں میں کم ہو کر ۷ء۰۹ فی صد رہ گئی جب کہ کم آمدنی والے ممالک میں یہ ۲۳ فی صد ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اسی عرصے میں مجموعی قومی بچتوں (GNS) کی شرح مجموعی قومی آمدنی (GNP) میں ۱۲ء۰۴ فی صد سے بڑھ کر ۱۴ء۲۶ فی صد ہو گئی جسکی واحد وجہ یہ ہے کہ داخلی صرفے (CONSUMPTION) کو پورا کرنے کے لیے بیرونی ذرائع (ورکرز کی بھیجی ہوئی رقوم) پر انحصار بڑھ گیا۔ جو داخلی بچت میں کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جوں جوں باہر سے بھیجی ہوئی رقوم میں کمی واقع ہوتی جائیگی داخلی صرفے کے بڑھنے کے ساتھ قومی اور داخلی بچتوں میں اضافہ مشکل تر ہو جائے گا۔ اس کے لیے غیر پیداواری مصارف اور سامانِ تعیش کی کھپت کے طرز عمل ٹیکسوں کے نظام اور کالے دھن کے متوازی غیر رسمی معیشت کے حوالے سے اہم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

(۴) پاکستان جیسے پسماندہ ملک کی نشوونما کے لیے ایک نازک پیمانہ یہ ہے کہ اس کی برآمدات کی شرح قدر میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے اور اس میں بھی مصنوعات کا حصہ کتنا ہے؟ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے عرصہ میں برآمدات کی شرح قدر میں اضافہ فقط ۴ء۱ فی صد رہا جو منصوبے کے ہدف پندرہ فی صد سے کم رہا صرف شرح قدر میں اضافہ ہی قلیل نہ تھا بلکہ برآمدات کی مجموعی تعداد میں بھی آٹھ فی صد سالانہ اضافہ ہوا۔ اس کی تین اہم وجوہات ہیں۔

(الف) باوجود یہ کہ صنعتی اشیاء کی برآمد اس وقت کل برآمدات کا نصف ہو گئی ہیں لیکن ہنوز کل برآمدات کا ۸۰ فی صد زرعی بنیاد کا حامل ہے اور صنعتی اشیاء میں بھی ٹیکسٹائل کا حصہ حاوی ہے۔

(ب) زرعی بنیاد کی حامل برآمدات کے خلاف عالمی منڈی میں تجارتی پابندیاں کافی سخت اور زیادہ ہیں۔

(ج) ان اشیاء کی قدر عالمی منڈی میں کم ہے۔ نتیجتاً پاکستان کی شرائط تجارت (TERMS OF TRADE) ۴ء۱۰۸ فی صد (۷۸/۱۹۷۷ء) سے کم ہو کر ۹ء۸۸ فی صد (۸۶/۱۹۸۵ء) رہ گئیں لہٰذا نہ صرف یہ کہ ضروری نشوونما کے لیے زرمبادلہ کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔ بلکہ ہماری برآمدات، درآمدات کا نصف ہیں۔ جس سے تجارتی خسارہ بڑھتا ہے اور توازن ادائیگی کی پوزیشن خراب ہوتی جاتی ہے۔

ان بورژوا پیمانوں پر معیشت کی نشوونما کے دعوے آئندہ برسوں میں پٹ جائیں گے۔ جبکہ نشوونما میں کمی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ۸۷/۱۹۸۶ء میں داخلی پیداوار (GDP) کی نشوونما کم ہو کر ۷ء۵ فی صد رہ گئی ہے جبکہ اس مالی سال میں اس کا ہدف سات فی صد بتایا گیا تھا۔

دست نگر معیشت کا دیوالیہ پن اور اس کے مضمرات

(ا) قبل ازیں ہم دست نگری کی جدید نوآبادیاتی حکمت عملی اور اس کے مضمرات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ہماری معیشت کے بودے پن کی اصل بنیاد یہی ہے۔ عالمی سرمایہ داری کے مراکز CORES سے ہماری نواحی سرمایہ داری PERIPHERAL CAPITALISM. کے نہایت غیر ہموار اور غیر مساوی رشتے، عالمی تقسیم محنت میں کمتر مقام، عالمی پیمانوں، اجارہ دارانہ قیمتوں، عالمی سرمائے کی بالادستی و سامراجی شرائط پر جدید نوآبادیاتی نشوونما سے ایک ایسا دست نگر سرمایہ دارانہ معاشی ڈھانچہ وجود میں آیا ہے۔ جس میں اندرونی تقاضوں اور عوامل ENDOGENOUS سے ہم آہنگ معاشی نشوونما نہیں ہو پاتی بلکہ خارجی عوامل EXOGENOUS, کے زیر اثر بے میل، بے ترتیب رکی ہوئی نشوونما ہو پاتی ہے۔ جو پسماندہ معاشی ڈھانچے کی تشکیل کرتی ہے۔ ہماری دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت اور جدید نوآبادیاتی ریاست میں حکمران طاقتوں اور سول و ملٹری بیوروکریسی کے طاقتور گروہ، اپنے اپنے مخصوص مفادات اور اداراتی تقاضوں STRUCTURAL IMPERATIVES کے تئیں معیشت کے مختلف شعبوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم مجموعی داخلی پیداوار میں اشیا اور تجارت و خدمات کے حصے کے ناطے معیشت کی بودی بنیادوں کی نشاندہی کریں گے۔

اوّل:۔ نواحی سرمایہ کے اجتماع و ارتکاز کا عمل اتنا پچھڑا ہوا ہے کہ عالمی قیمتوں، پیمانوں، مستقل سرمائے کی اعلیٰ شرح اور درآمد شدہ مشینری، آلات، صنعتی خام مال اور درمیانی اشیا کی اجارہ دارانہ قیمتوں پر صنعتی شعبہ کا پچھڑا رہ جانا لازمی امر ہے۔ نتیجتاً ریاستی سرپرستی، درآمدی تقاضات، زیادہ شرح تبادلہ، امدادی رقوم جس پر ٹیکسٹائل، خوراک اور دیگر اشیائے مصارف کی صنعتیں حاوی ہیں۔ جبکہ مشینری، آلات کیپٹل گڈز، دھات سازی وغیرہ کی بنیادی صنعت و بھاری صنعتی (چند ایک اشیاء کو چھوڑ کر) شعبہ پچھڑا ہوا رہ گیا ہے۔

دوم:۔ اشیاء کی پیداوار کا صنعتی شعبہ بھی تب ہی مستحکم بنیادوں پر ترقی پا سکتا ہے۔ جب آلات پیداوار و مشینری کی پیداوار کا صنعتی شعبہ ترقی کرتا۔ مزید برآں بڑے پیمانے کی صنعتی نشو و نما کی شرح چھوٹے پیمانے کی صنعتی نشو و نما سے کم ہے۔ متبادل درآمد حکمت عملی اور ریاستی تحفظات اور سرپرستی کے تحت وجود میں آنے والے صنعتی اشیاء کی پیداوار کا شعبہ ورلڈ بینک (عالمی مالیاتی فنڈ) سٹرکچرل ردو بدل کے پروگرام اور شرائط قرضہ جات کے تحت داخلی منڈی میں آزاد منڈی میکنزم کے تحت بیرونی اشیاء کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ کیونکہ ان صنعتی اشیا کی قیمتیں عالمی قیمتوں سے زیادہ ہیں۔ چونکہ ایک طرف سرمایہ کے اجتماع و ارتکاز کی سطح ایسی نہیں تھی اور دوسری طرف برآمدی رخ کی صنعتی حکمت عملی نہ اختیار کرنے کے کارن ہمارے صنعتی شعبے کا مجموعی سکیل اور صلاحیت ایسی نہیں کہ صنعتی اشیا کی برآمدات کے ذریعہ معیشت میں صنعتی شعبہ کو مہمیز ملے۔ ان مختلف عوامل سے اندرونی و بیرونی اور دست نگر سرمائے کی مخصوص نشو و نما کے کارن ہماری مجموعی داخلی پیداوار کا فقط ۲۰٫۵۵ فی صد صنعتی اشیا پر مشتمل ہے۔ مضبوط صنعتی بنیاد کی تشکیل اور صنعتی انقلاب کے لیے نہ صرف معیشت کی دست نگر و جدید نو آبادیاتی بنیاد بلکہ معاشی نشو و نما کے پیمانوں کو یکسر بدلنا ہو گا۔

سوم:۔ تقابلی فائدے کے نظریہ کے مطابق زراعت کو ہمارے قومی وظائف کے حسب حال بنا کر معیشت کی بنیاد یا "ریڑھ کی ہڈی" قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ آبادی کی اکثریت کے زراعت سے منسلک ہونے کے باوجود مجموعی داخلی پیداوار میں اس کا حصہ ۵۳٫۱۹ فی صد (۱۹۴۹/۵۰ء) سے کم ہو کر ۲۵٫۵۴ فی صد رہ گیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ مضبوط اداراتی و سائنسی گارنٹی کی بجائے زرعی پیداوار موسمی حالات کے رحم و کرم پر ہے اور ملک ابھی تک اناج کی پیداوار میں بھی خود کفیل نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی سرمایہ دارانہ اجتماع

دارتکاز کے عمل میں زراعت کے زائد کا استحصال صنعت و تجارت میں ہوتا جاتا ہے اور زرعی شعبہ بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔

زراعت میں سرمایہ داری کے عمل نے جو مخصوص صورت اختیار کی وہ دوہرے پیمانے UNIMODAL کی سبز انقلاب کی حکمت عملی تھی جس کا بنیادی زور بڑے پیمانے کے سرمایہ دارانہ و تجارتی فارموں کی ترقی پر تھا اور اس سے یہ امید باندھی گئی تھی کہ بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ فروغ نچلی سطح کے کھیتوں پر بھی نتیجتاً اپنے اثرات مرتب TRICKLE DOWN EFFECTS کرے گا۔ یہ حکمت عملی جاپان جنوبی کوریا اور تائیوان کی ایک پیمانے UNIMODAL کی حکمت عملی کے برعکس تھی جو تمام زرعی شعبے کی مجموعی نشو و نما پر زور دیتی ہے۔ زرعی شعبے میں اختیار کی گئی دوہرے پیمانے کی حکمت عملی بڑے زمینداروں اور زرعی خواص کے حسب حال تھی جس کے زرعی شعبے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اور ملک "زرعی" ہونے کے باوجود پیداوار میں خود کفیل نہ ہو سکا اور زراعت میں سرمایہ دارانہ فروغ سے جس شدت سے پرانے رشتے ٹوٹے اس شدت سے ان میں تبدیلی نہیں آئی۔ "سبز انقلاب" سے قبل کسانوں کی خود کفیل معیشت، خاندانی محنت جانوروں کے بھرپور استعمال INTENSIVE USE. کو روایتی برتری حاصل تھی حالانکہ یہ ایک مقام پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ بجائے اس کے کہ زور دار زرعی اصلاحات کے ساتھ ساتھ سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی کو چھوٹے پیمانے کے کھیتوں کو غریب اور درمیانے کسانوں کے حق میں استعمال کیا جاتا۔ یہ سبز انقلاب کی حکمت عملی ہر اعتبار سے بڑے زمین داروں کے حق میں استعمال ہوتی۔ سائز اور کارکردگی SIZE-EFFICIENCY RELATIONSHIP کے درمیان تعلق، پانی، کھاد، اعلیٰ پیداوار بیجوں اور بھاری ٹریکٹروں کے ناطے ٹیکنالوجی ہی بڑے فارموں کے حق میں نہ تھی بلکہ قرضہ جات و امدادی رقوم اور منڈی کے میکنزم کی سمت بھی انہی کی موافقت میں تھی جس کے تین اہم مضمرات مرتب ہوئے۔

(الف) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۸ء کے درمیانی عرصہ میں ۱۵۰ ایکڑ سے زائد فارموں کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ان کے زیر کاشت رقبہ (۱۹۷۸ء) کے نصف کے مساوی تھا جس کا ۶۵ فی صد انہوں نے یا تو بٹائی پر کام کرنے والوں یا نچلے متوسط مالکوں سے حاصل کیا اور اس وقت کل دیہی مالکوں کا ۰،۵ فی صد ۳۰ فی صد زیر کاشت رقبہ کا مالک ہے۔

زرعی سرمایہ داری کے بڑے زمین داروں کے حق میں فروغ سے یہ ہوا کہ ایک طرف زوال پذیر طرز ہائے محنت LABOUR PROCESSES اور استحصال کی ازکار رفتہ صورتیں خاص طور پر غیر معاشی جبر کے باوجود براہ راست پیداوار کرنے والے کو رسماً

سرمائے کے مفاد میں گھسیٹ لائی۔ FORMAL SUBSUMPTION OF LABOUR TO CAPITAL یعنی بڑے پیمانے کی زرعی سرمایہ داری کے فروغ میں دقیانوسی ڈھانچوں اور محنت کی صورتیں بھی ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی ہیں۔ دوسری طرف پرانے پیداواری رشتوں کے تیزی سے ٹوٹنے اور براہ راست پیداوار کرنے والوں کی ذرائع پیداوار سے بیگانگی کے عمل سے دیہی محنت کا سرمائے کے ساتھ حقیقی رشتوں میں بندھ گئے۔ REAL SUBSUMPTION OF LABOUR TO CAPITAL لیکن بالعموم یہ ہوا کہ جتنا براہ راست پیداوار کرنے والے کی ذرائع پیداوار سے بیگانگی پیدا ہوئی اتنا آزاد محنت کش طبقے کا وجود سرعت سے وجود میں نہیں آیا کیونکہ بڑا زمیندار غیر معاشی جبر، بندھی ہوئی محنت کی قابل یقین فراہمی کے باعث ملی جلی صورتوں پر زور دیتا ہے۔

(ب) باوجود یہ کہ پاکستان میں ۸۸ فی صد کھیت ۲۵ ایکڑ سے کم کے ہیں سبز انقلاب کی حکمت عملی ان کھیتوں سے متعلق مالکوں درمیانے اور غریب کسانوں کے خلاف تھی کیونکہ سائز اور کارکردگی کا پیمانہ چھوٹے اور نچلے درجے متوسط کھیتوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔ مزید برآں نئی ٹیکنالوجی کے لیے ضروری سرمایہ، قرضوں کا نظام اور سماجی ریاستی ڈھانچہ ۵ء۷ سے ۲۵ ایکڑ کے کاشت کاروں اور کسانوں کے حق میں نہ تھا۔ نتیجتاً نہ صرف ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۸ء کے درمیانی برسوں میں ان کے زیر کاشت رقبہ میں بالعموم کمی واقع ہوئی بلکہ ان کے کھیت غیر منفعت بخش ہوتے جا رہے ہیں۔

(ج) ۵ء۷ ایکڑ تک کے غریب مزارعین و ہاری، غریب کسان اور دیہی غریب اس حکمت عملی میں تہرے طور پر پس کر رہ گئے ہیں۔ ایک طرف ان دیہی طبقوں اور پرتوں میں اضافہ ہوا ہے ان میں بے زمینی کم زمینی اور بیروزگاری کا عمل بے پناہ تیز ہوا ہے۔ ان کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ امیر کسانوں اور نچلے متوسط مالکوں کے ان کی صفوں میں شامل ہونے سے ہوا۔ نئی ٹیکنالوجی سے ان کے کھیت زرعی پیداوار کے لیے منفعت بخش نہیں رہے اور ان کا خرچہ MONEY COSTS پیداوار کے مقابلے/میں اضافی طور پر بڑھ رہا ہے۔ ایک حد کے بعد ان کھیتوں کی پیداوار بہت کم ہو گئی ہے لیکن ان کا بحران خاندانی محنت کے کارن ۵ء۷ سے ۲۵ ایکڑ کے کھیتوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔ کمزور معاشی و سماجی بنیاد کے باعث زرعی منڈی کا موسمی اتار چڑھاؤ سستا بیچنے اور مہنگا خریدنے پر مجبور کرتا ہے۔

زرعی سرمایہ داری کی اس حکمت عملی کے نتیجہ میں زراعت نہ صرف ایک لاینحل بحران کی لپیٹ میں ہے بلکہ یہ معیشت کی مجموعی نشو و نما کے لیے کمزور بنیاد فراہم کرتی

ہے۔ اس صورتحال کو بدلنے کے لیے ایک طرف بڑے زمینداروں کی سماجی سیاسی بنیاد ختم کرتے ہوئے زور دار انقلابی اصلاحات کی ضرورت ہے اور دوسری طرف سائنس و ٹیکنالوجی، اداراتی ملک پالیسیوں کو یکسر غریب و درمیانے کسانوں اور نچلے متوسط مالکوں کے حق میں کرنا ہوگا اور زرعی پیداوار کا اچھے موسم پر دار و مدار بتدریج کم کرنا ہوگا۔ فی ایکڑ پیداوار جو اس وقت استعمال ہونے والے بیجوں کا ایک تہائی ہے کو بڑھانے کے لیے ضروری سہولیات کی فراہمی اور صرف نہری علاقوں میں ۲۱٫۸ ملین ایکڑ اراضی کو زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ جبکہ آب پاشی کے موجودہ نظام کو بہتر کرنے کی ضرورت ہو گی۔ اس وقت تقریباً ۵۰ فی صد پانی کھیتوں تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جاتا ہے۔

چہارم:۔ جو امر سب سے تشویشناک ہے وہ ہے تجارت و خدمات کے غیر پیداواری شعبوں کا معیشت کے پیداواری شعبوں کے مقابلے میں زیادہ نشو و نما پانا۔ پاکستان میں یہ عمل یورپ کے تاریخی تسلسل سے قطعی مختلف ہے۔ جہاں صنعتی انقلاب کے طویل عرصہ کے بعد تجارت و خدمات کے شعبوں کا مخصوص اضافہ، ایک طرف عالمی سرمایہ داری میں مختلف نوعیت کا حامل ہے، جسے سائنس و ٹیکنالوجی کے انقلاب نے صنعتی طور پر مختلف کردار بخش دیا ہے۔ ہمارے ہاں گردشی سرمائے کے میدان کی وسعت، پیداواری سرمائے کے سائیکل کی طوالت، مستقل سرمائے کی اعلیٰ شرح ریاست اور بورژوازی مفت خوری، بھاری بھر کم ریاستی ڈھانچے کا بے پناہ بوجھ بیرون ملک گئے پاکستانیوں کی بھیجی ہوئی رقوم کے غیر پیداواری مصارف پبلک و نجی بچتوں کی شرح کا کم ہونا مضبوط صنعتی بنیاد کے نہ ہونے اور دست نگری کے جدید نو آبادیاتی رشتوں کے نتیجہ میں تجارت و خدمات کے شعبے بڑھتے اور پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ اس وقت مجموعی داخلی پیداوار میں زراعت و صنعت کے شعبوں کے حصے کے مساوی ہو گئے ہیں۔ یعنی مجموعی پیداوار میں ان کا حصہ ۵۶٫۴۴ فی صد (۱۹۸۶/۸۷ء) ہے جو دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کے نحیف پسماندہ غیر برآمداتی بنیاد کی عکاسی کرتی ہے۔ ان شعبوں کی نشو و نما کا چلن یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر معاشی ڈھانچے خاص طور پر اس کے دست نگر و پسماندہ پیداواری ڈھانچے کو یکسر نہ بدلا گیا تو غیر پیداواری تجارت و خدمات کے شعبے معیشت پر مزید حاوی ہوتے جائیں گے۔

(۲) دست نگری کے باعث ملکی معیشت اس قابل نہیں ہو سکی کہ اپنی سرمایہ کاری کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ طویل المدتی منصوبے PERSPECTIVE PLAN (۸۵-۱۹۶۰ء) میں کہا گیا کہ منصوبے کے آخری برسوں میں ملک اپنی سرمایہ کاری کی ضرورتوں

میں خود کفیل ہو جائے گا۔ یہی دعوے چھٹے پنجسالہ منصوبے اور ورلڈ بینک کی طرف سے کئے جاتے رہے ہیں لیکن اب مجموعی داخلی پیداوار میں داخلی بچت کی کم شرح کے حوالے سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ضروری سرمایہ کاری کے لیے بیرونی سرمائے کا حصہ بڑھ کر ایک تہائی ہو جائے گی۔ عالمی سرمائے کے ساتھ دوہرے جدید نوآبادیاتی رشتوں کے بموجب پاکستان کے ذرائع اجتماع اور زائد قدر ہر لحظہ بڑھتے ہوئے پیمانے پر عالمی سرمائے کے مراکز میں مجتمع ہوتا جاتا ہے اور جتنا یہ عمل بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی لوازمی سرمایہ کے اجتماع کا عمل گھٹا پھٹا رہ جاتا ہے اور جتنا یہ پچھڑا ہوا رہ جاتا ہے اتنا ہی عالمی سرمائے کی دست نگری بڑھتی جاتی ہے سامراجی سرمایہ کی مسلط کردہ یکطرفہ غیر مساوی تقسیم محنت، غیر مساوی تجارت، شرح تبادلہ میں مسلسل کمی شرائط تجارت کا تنزل، تجارتی خسارہ اور توازن ادائیگی کا بیگاڑ اور عالمی اجارہ دارانہ قیمتوں اور پیمانوں پر سرمایہ کاری کی ناموافق شرائط بچتوں اور متعین سرمایہ کاری کی کم شرح نہ صرف صنعتی و تکنیکی بنیاد کے پچھڑے رہنے کا باعث بنتی ہے اور نتیجتاً یہ سب عوامل عالمی سرمائے کی محتاجی کو مستقل صورت دے دیتے ہیں۔ جتنا قرضوں کی صورت میں عالمی سرمایہ بڑھتا ہے اتنا ہی دست نگر معیشت کے لیے ان کی ضرورت مستقل عارضہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

گذشتہ دہائی میں بیرونی قرضوں میں اضافہ ۲ء۲۰ فی صد سالانہ کی شرح سے ہوا ہے۔ بیرونی قرضوں کی سالانہ مقدار ۲۱۵ ملین ڈالر سے بڑھ کر چھٹے پنج سالہ منصوبے میں ۱۸۰۹ ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ جتنا بیرونی سرمایہ پر انحصار بڑھتا ہے اتنا ہی گرانٹس کی شرح ۲۰ فی صد اور قرضوں کی شرح ۸۰ فی صد میں بدل گئی ہے۔ دست نگر معیشت جتنا عالمی سامراج کے ہاتھوں لٹتی ہے اتنی ہی اس کی قرضوں سے نجات مشکل ہوتی جاتی ہے۔ نتیجتاً قرضوں کی ادائیگی کے لیے قرضوں کے حصول کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نئے قرضوں کی نقد وصولی کم تر ہوتی جاتی ہے جو اس وقت ۱۲ فیصد (۸۷/۱۹۸۶ء) تک رہ گئی ہے اور ۸۸ فی صد سابقہ قرضوں کی ادائیگی میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ قرضوں کی قسط کی ادائیگی ہماری برآمدات کا ۲ء۲۷ ہو گئی ہے۔ رواں مالی سال (۸۹/۱۹۸۸ء) میں بیرونی قرضہ جات ۱۴ ارب ڈالر سے تجاوز کر جائیں گے۔

قرضوں کے بوجھ کا معاملہ فقط بیرونی قرضوں تک محدود نہیں ہے کیونکہ اندرونی قرضوں میں اضافہ اور بھی زیادہ سنگین ہے جو ۸۲۰۴۰ ملین روپے (۸۰/۱۹۷۹ء) سے بڑھ کر ۲۳۵،۲۳۳ ملین روپے (مارچ ۱۹۸۷ء) ہو گئے اور مجموعی داخلی پیداوار کا (۸۸/۱۹۸۷ء) میں ۴۰ فی صد تھے۔ اندرونی قرضہ جات ۲۰ فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہے ہیں جن

پر سالانہ سود ۲۷ فی صد کی شرح سے بڑھ رہا ہے۔

بیرونی و اندرونی قرضے معیشت پر اتنا بوجھ بن گئے ہیں کہ کل سرکاری مالیات REVENUE کا ۵۵ فی صد ان کی نذر ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۷ء کے سالوں میں قرضوں پر سود کی ادائیگی پر ۳۴ فی صد کا اضافہ ہوا۔ جس سے اعلیٰ شرح سود کا اندازہ ہوتا ہے چونکہ ان اندرونی قرضوں کے زیادہ تر مصارف غیر پیداواری ہیں۔ اس لیے ان کے مجموعی معیشت پر مضمرات اور بھی زیادہ منفی ہیں۔ ملکی معیشت اور معاشی اشیا کا جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ اندرونی و بیرونی قرضوں پر انحصار میں اضافہ بڑھتا جائے گا۔ تاآنکہ عالمی سرمایے کی دست نگری، شرائط قرضہ جات اور اندرونی مالیاتی پالیسی اور غیر پیداواری اخراجات میں بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

(۳) ضیاء کے دور میں جس معاشی عنصر نے پوری معاشی زندگی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کئے اور اس نے معیشت کے ایک اہم بنیادی عنصر کی صورت لے لی حالانکہ اس کا تعلق معیشت کی اندرونی نشو و نما سے نہ تھا، EXOGENOUS. وہ تھی ورکرز کی مشرق وسطیٰ سے بڑے پیمانے پر برآمد اور ان کی بھیجی ہوئی ریکارڈ رقوم۔ ورکرز کی برآمد اور ان کے بھیجی ہوئی رقوم کے ہمہ طرفہ مضمرات کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے۔

اوّل:۔ مشرقی وسطیٰ سے بھیجی ہوئی ریکارڈ رقوم جو ۷۷/۱۹۷۶ء کے سال میں ۴۳۴ ملین ڈالر تھیں، عروج کے سال ۸۳/۱۹۸۲ء میں پانچ گنا بڑھ کر ۲۴۰۳ ملین ڈالر ہو گئیں۔ (حالانکہ ان میں اشیا اور پرائیویٹ ذریعوں سے بھیجی ہوئی رقوم شامل نہیں ہیں) اس حوالے سے مجموعی داخلی پیداوار اور مجموعی قومی بچت (GNS) کی بڑھی ہوئی شرح پر اس کے اثر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

دوم:۔ عروج کے سال (۸۳/۱۹۸۲ء) میں کل توازن تجارت میں ان رقوم نے ۷۵٫۶۱ فی صد حصہ ادا کیا جبکہ یہ ۷۷/۱۹۷۶ء میں صرف ۲۶٫۴ فی صد کے مساوی تھیں۔ اسی طرح ہماری برآمدات، جو زر مبادلہ کمانے کا ذریعہ ہیں اور زیادہ تر زرعی بنیاد کی حامل ہوں، میں ان کا حصہ ۱۵٫۰۹ فی صد (۷۷/۱۹۷۶ء) سے بڑھ کر ۳۶٫۴۸ (۸۳/۱۹۸۲ء) ہو گیا۔ نتیجتاً اس سے معیشت کے لیے ضروری زر مبادلہ میسر آیا اور توازن ادائیگی پر سخت دباؤ میں کمی آئی۔ خاص طور پر شرائط تجارت میں کمی کے رجحان اور آزاد منش تجارت کے ناطے TRADE LIBERALISATION. بڑھتی ہوئی درآمدات تلے بڑھتا ہوا تجارتی خسارہ کم رکھا جا سکا۔

سوم:۔ قرضوں کی ادائیگی قسط، جو ان رقوم کے ۸۹٫۱ فی صد (۷۷/۱۹۷۶ء) کے مساوی

تھی ان رقوم کے بڑھنے (اور بعض دوسرے عوامل) سے کم ہو کر ۲۶٫۳۸ فی صد رہ گئی حالانکہ بیرونی سرمائے پر ان برسوں میں انحصار جتنا زیادہ تھا ان رقوم کے باعث اس کا اتنا منفی اثر مرتب نہیں ہوا اور یہ ۱۲٫۵ فی صد تک کم ہو گیا جو کہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء کے سالوں میں ۲۲٫۳ فی صد اور ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۵ء کے سالوں میں ۵٫۳ ۴ فی صد تھا۔ یہ معیشت کی اندرونی صحت اور ٹھوس نشو ونما کے نتیجہ میں نہیں بلکہ انسانی محنت کے خارجہ ضرورت کے تحت بنیادی شعبے کے طور پر اس کی برآمد سے ہوا۔

چہارم:۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے مطابق پانچویں پانچ سالہ منصوبے کے عرصہ میں اضافہ شدہ افرادی قوت کا ایک تہائی مشرق وسطی کے ممالک میں کھپ گیا جس سے ایک طرف بے روزگاری کے دباؤ میں کمی آئی اور دوسری طرف ملک میں بعض پیشوں سے متعلق ہنر مندوں کی کمی بھی واقع ہوئی۔ ہنر مند و نیم ہنر مند مزدوروں کے باہر جانے سے تعمیرات اور بڑے پیمانے کی صنعت میں حقیقی اجرتوں میں نسبتاً اضافہ اور استحکام پیدا ہوا۔

پنجم:۔ داخلی کھپت (CONSUMPTION.) اور سرمایہ کاری کے حوالے سے یہ رقوم مالی ذرائع بصورت روپیہ فراہم کرتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۶ء کے درمیانی برسوں میں صرف سرکاری ذرائع سے وصول کردہ رقوم ۲۰۳ ارب روپے اور اگر غیر سرکاری ذریعوں کو (۲۵ فی صد کے حساب سے) شامل کر لیا جائے تو یہ رقوم ۲۷۱ ارب روپے تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ رقم انہیں برسوں میں پرائیویٹ سیکٹر کی کل سرمایہ کاری جو ۱۹۲ روپے تھی، سے مطلق طور پر شاید تھی۔ اس دوران کل کھپت پر آنے والے اخراجات میں ۳۶۵ ارب روپے کا اضافہ ہوا۔ جس میں ایک تحقیق کے مطابق ان رقوم (REMITTANCES) کا حصہ ۳۴٫۶۰ فی صد (۱۲۳ ارب روپے) اور دوسرے اندازے کے مطابق ان کا حصہ ۴۴٫۶۴ فی صد (۱۶۵ ارب روپے) تھا۔

ملکی منڈی میں اتنے پیسے کا آنا کافی اثر انگیز تھا۔ خاص طور پر جس طرح یہ رقوم صرف میں آئیں انہوں نے معاشی نشو ونما کے ڈھانچے اور معاشرے کے رنگ ڈھنگ پر محصوص اور دور رس اثرات مرتب کئے گو اس بارے میں واضح تحقیقات نہیں کی گئیں لیکن جو روز مرہ شواہد اور محدود تحقیقات موجود ہیں ان سے بعض نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ہر دو تحقیقات کے مطابق ان رقوم کے استعمال کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔

CONSUMPTION اور NON-CONSUMPTION کے اخراجات قریب قریب ہیں جب کہ ۶۳٫۳ فی صد ذاتی کھپت میں صرف ہوئے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۸٫۱ فی صد مختلف طرح کی سرمایہ کاری اور ۱۷٫۳ فی صد شہری و دیہی زمین کے پلاٹس ESTATES

پر خرچ آئے۔ روز مرّہ اصراف کے اخراجات کا بڑا حصہ اشیائے صرف روز مرّہ استعمال کی اشیا، بجلی کی اشیا کراکری آرائش و زیبائش، شادی بیاہ، رسم و رواج، تحفے تحائف اور حج وغیرہ پر خرچ آیا۔ ان میں بہت سی اشیا خاص طور پر بجلی کا سامان، کراکری، آرائش و زیبائش کی اشیا بیرون ملک سے لائی گئیں اور بہت سی مقامی منڈی میں خریدی گئیں۔ متوسط میں جہاں پھیلاؤ آیا وہاں ان کے رہن سہن رنگ ڈھنگ نے پورے معاشرے میں اشیا پرستی کے کلچر فروغ ملا۔ ان رقوم کا ایک بڑا حصہ رہائش گاہوں کی تعمیر یا پہلے سے موجود رہائش گاہوں کی توسیع وہ تزئین، شہری و دیہی جائیداد تجارت، ٹرانسپورٹ، چھوٹے پیمانے کی صنعت اور زراعت میں استعمال میں آیا۔ اخراجات کی ان تین جہتوں نے معیشت اور منڈی پر اچھے خاصے اثرات مرتب کئے:

(الف) تجارت و خدمات کے شعبے کا فروغ سب سے زیادہ ہوا کہ منڈی میں ایک مستحکم صارف موجود تھا جس کے زیادہ تر حصہ درمیانی اشیا تعیش اور اسٹیٹس کی اشیا کو فروغ ملا۔ اشیاء جو کل تک روز مرّہ ضروریات میں شامل نہ تھیں، اب ان کا حصول ضروری سماجی قدر بن گیا۔ رنگین ٹیلی وژن، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، فریج، واشنگ مشین، ایئر کنڈیشنر، موٹر سائیکل، کار، اچھا لباس، آرائش، جیولری و قیمتی تحائف وغیرہ۔

(ب) معیشت کے جو شعبے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں تجارت تعمیرات، اسٹیٹ بزنس، ٹرانسپورٹ، ذرائع رسل و رسائل اور چھوٹے پیمانے کی بعض صنعتیں شامل ہیں۔ تعمیرات کے شعبہ میں ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۶ء کے سالوں میں ۸ فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے جو ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء کے سالوں کے مقابلے میں ۳۰ فی صد زیادہ ہے۔ اس سے جہاں کنسٹرکشن میٹیریل سے متعلق صنعتوں اور کاروبار کو فروغ ملا اور شہری و دیہی زمین خاص طور پر شہری زمین کی قیمتیں بہت چڑھ گئیں اور اسٹیٹ بزنس کو فروغ ملا۔ اسی کے نتیجے میں بجلی کے سامان (FITTINGS AND CABLES) سینیٹری کی اشیا اور دھات و لکڑی کی اشیا کی صنعت کو فروغ ملا۔ اشیا صرف (CONSUMER GOODS) اور روز مرّہ استعمال کی اشیا (DURABLE GOODS) کی بڑھتی ہوئی مانگ سے بہت سی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ ملا۔ مثلاً پلاسٹک کی انڈسٹری، دھات کی اشیا کی صنعت اور انجینئرنگ اشیا کی صنعتوں کو فروغ ملا۔ ان صنعتوں میں کام آنے والے خام مال اور مشینری پیداوار کی صنعت نے بھی نتیجتاً فروغ پایا۔ اس عرصہ میں چھوٹے پیمانے کی صنعت کے فروغ ان نئے صارفین نے اہم کردار ادا کیا۔

اسی طرح ٹرانسپورٹ، ذرائع رسل و رسائل، ہوٹل انڈسٹری اور ان سے متعلق

کاروبار نے بھی پہلے سے زیادہ شرح سے ترقی کی۔ جب کہ رہائش گاہوں پر بیرون ملک سے آئی رقوم کا ۳۳ فی صد تا ۴۴ فی صد حصہ خرچ ہوا۔

(ج) متعین سرمایہ کاری میں ان رقوم کے حصہ کے بارے میں کوئی براہ راست حاصل شدہ حقائق نہیں ہیں۔ ثانوی اور بالواسطہ اندازوں کے مطابق زراعت میں ۱۳ تا ۱۷ فی صد اور گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعت نے ۵ء۵۳ فی صد تا ۳ء۱۷ فی صد ہے جو غالباً حقیقت سے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے۔ عام شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر تجارت، ٹرانسپورٹ اور کرائے کی آمدنیوں کے لیے دکانوں اور گھروں کی تعمیر پر خرچ آیا۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ معیشت کے ہر شعبے پر اس نے براہ راست اور بالواسطہ گہرے اثرات مرتب کئے۔ ۱۹۸۲/۸۳ء کے بعد محنت کی درآمد کرنے والے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں معاشی سرگرمیوں خاص طور پر تعمیرات کے شعبے میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجتاً نیم ہنرمند، ہنرمند اور غیر ہنرمند افرادی قوت کی جہاں ضرورت اسی حساب سے کم ہو رہی ہے۔ وہاں لیبر مارکیٹ میں مقابلہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ باوجودیکہ اس ضمن میں صورت حال کافی غیر یقینی ہے اس ضمن میں عام اتفاق ہے کہ مشرق وسطیٰ میں کاروباری چہل پہل کے عروج کا دور گذر گیا ہے اور محنت کی نقل مکانی نے جو شدت ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۸ء کے سالوں میں اختیار کی تھی اس میں ویسی شدت پھر سے پیدا نہیں ہو گی۔ چونکہ بیرون ملک پاکستانیوں کی بھیجی ہوئی رقوم کا تین چوتھائی ان سالوں میں مشرق وسطیٰ سے آتا رہا ہے۔ لہٰذا اس کا براہ راست اثر ان رقوم میں مسلسل کمی اور ورکرز کی واپسی کی صورت میں ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۶/۸۷ء میں یہ کم ہو کر ۶۱ء۱۹۷۳ ملین ڈالر رہ گئیں جبکہ عروج کے سال (۱۹۸۲/۸۳ء) میں یہ ۶۱ء۲۴۰۸ ملین ڈالر تھیں۔ نتیجتاً تمام معاشی عشاریوں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر زر مبادلہ کے اس اہم ذریعہ میں کمی سے توازن ادائیگی پر دباؤ بڑھ جائے گا اور اس کے ساتھ ہی تجارتی خسارہ بھی بڑھنے لگے گا اور بیرونی قرضوں پر انحصار مزید بڑھ جائے گا۔ آئی۔ ایل۔ او کی تحقیق کے مطابق ۱۹۹۰ء تک یہ رقم ۶ء۱ تا ۷ء۱ بلین ڈالر رہ جانی تھیں جبکہ یہ ۱۹۸۷/۸۸ء میں ہی ۷ء۱ بلین ڈالر سے کم ہو گئی ہیں۔ افرادی قوت کی برآمد میں کمی اور برآمد شدہ افرادی قوت کی واپسی (ایک اندازے کے مطابق ہر سال ساٹھ ہزار ورکرز واپس آ رہے ہیں) سے روزگار کے مواقع جو پہلے ہی محدود ہیں، پر دباؤ بڑھ جائے گا۔

(۴) پاکستان ان کم آمدنی والے ممالک میں شامل ہے جن کے پاس نہ تو تیل کی طرح کے ذرائع ہیں اور نہ برآمدی رخ کی حکمت عملی کے تحت وجود میں آنے والا

صنعتی ڈھانچہ ہے۔ جن کی بنیاد پر اس برآمدات کی کوئی ایسی مستحکم بنیاد ہو۔ جو زرمبادلہ کے حصول کو قابل انحصار بنا سکے۔ زر مبادلہ کے حصول کے لیے ہماری برآمدات کا ۸۰ فی صد زرعی بنیاد کا حامل ہے جس کی شرائط تجارت غیر مساوی ہیں اور تجارتی بندش اس کے فروغ پر روک کا باعث بنی ہوئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اضافہ شدہ قدر کے حوالے سے ان کی شرح اضافہ بہت کم ہے بلکہ ان کی مقدار میں بھی اضافہ ضرورت سے کہیں کم ہے چھٹے پانچ سالہ منصوبہ میں برآمدات میں متوقع ۱۵ فی صد سالانہ اضافہ کے برعکس فقط ۴ فی صد سالانہ اضافہ ہو پایا۔ برآمدات کی زرعی بنیاد اور بھی ناقابل انحصار ہو جاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا دارومدار موافق موسمی حالات پر ہے۔ ایک بری فصل نہ صرف زرعی نشو و نما کے گراف کو منفی کر دیتی ہے بلکہ معیشت کی مجموعی نشوونما میں کمی کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ یہ برآمدات کو بری طرح سے متاثر کرتی ہے۔ جس طرح ۱۹۸۳/۸۴ء اور ۱۹۸۶/۸۷ء کے سالوں میں ہوا۔ ۱۹۸۳/۸۴ء جب بیک وقت فصل کی خرابی اور بیرون ملک سے بھیجی ہوئی رقوم میں کمی واقع ہوئی تو اسٹیٹ بینک کو ۳۰۰ ملین ڈالرز کے محفوظ ذخائر کو ختم کرنا پڑا۔ اسی طرح ۱۹۸۶/۸۷ء کے مالی سال میں گندم کی فصل کی خرابی کے نتیجے میں مجموعی داخلی پیداوار سات فیصد اندازے کے برعکس ۵٫۷ فی صد رہ گئی۔ زر مبادلہ کا دوسرا بڑا ذریعہ مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والے ورکرز کی بھیجی ہوئی رقوم میں ۱۹۸۳/۸۴ء کے بعد سے ۲۸ فی صد کمی واقع ہو چکی ہے اور اس وقت یہ کمی ۸۰۰ ملین ڈالرز ہو گئی ہے۔ زر مبادلہ کے حصول کی بودی بنیاد کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کاٹن اور کاٹن کی اشیا کل برآمدات کا ۵۵ فی صد ہیں اور بیرون ملک سے بھیجی ہوئی رقوم زرمبادلہ کی آمدنی کا اس وقت بھی ۴۰ فی صد ہیں اور بتدریج کم ہو رہی ہیں۔ مزید برآں یہ کہ صنعتی اشیا جنکی اضافہ شدہ قدر زیادہ ہوتی ہے کی برآمدات کے بڑھنے کے حالات نہایت ہی نامساعد ہیں کیونکہ ریاستی سرپرستی و تحقیقات کے تحت جو صنعتی ڈھانچہ وجود میں آیا وہ متبادل درآمد حکمت عملی پر مبنی ہے اور اس کا اسکیل (OPTIMAL SCALE) برآمدی رخ (EXPORT-ORIENTED) کا حامل ہے جبکہ یہ صنعتی ڈھانچہ زیادہ تر اشیا صرف کی صنعتوں کے شعبہ نمبر دو پر مشتمل ہے۔ اور معیشت اصل اساسی شعبہ نمبر ایک یعنی مشینری و آلات و دھات کی پیداوار کی صنعت ہنوز بکھری ہوئی ہے۔ جب تک دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کے عالمی سامراج سے دوہرے جدید نو آبادیاتی رشتوں، عالمی تقسیم محنت میں کم تر مقام، نشوونما کے پیمانوں اور انقلابی خطوط پر نہیں بدلا جائے گا۔ ہمارے آزاد خیال قومی بورژوا دانشوروں کا یہ خواب کہ صنعتی اشیا کی برآمدات بڑھیں پورا نہیں ہو سکتا۔

(۵) باوجود پاکستان میں توانائی کی فی کس کھپت (EOT - ۱۹۹۰ء) کم آمدنی والے ممالک کی اوسط کھپت کا نصف ہے توانائی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے مقابلے میں توانائی کی رسد میں مسلسل کمی نے ایک گمبھیر بحران کی صورت اختیار کر لی ہے، خاص طور پر بجلی کے بحران نے پوری معاشی و گھریلو زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ ذیل میں ہم توانائی کے بحران کے بعض پہلوؤں کا مختصر اً جائزہ لیں گے۔

(الف) پاکستان میں کل توانائی کی ۸۱ فی صد (۸۶/۱۹۸۵ء) فراہمی، تیل، گیس کوئلے اور مائع پیٹرولیم گیس LPG کے ذرائع فراہم کرتے ہیں اور اس میں بجلی ۱۸ فی صد اور نیوکلیائی توانائی کا حصہ ایک فیصد ہے۔ توانائی کے کل استعمال میں تیل ۴۰٫۲ فی صد اور گیس ۳۵ فی صد استعمال ہوتی ہے۔ بجلی کی پیداوار کے تین بڑے ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۶٫۲۹۸ میگاواٹ میں ہائیڈل پاور ۴۰٫۶ فی صد، تھرمل پاور ۵۱٫۸ فی صد اور نیوکلیائی پاور ۲٫۲ فی صد ہے۔

گزشتہ پانچ برسوں (۸۶/۱۹۸۵ء - ۸۱/۱۹۸۰ء) میں سرکاری اندازوں کے مطابق توانائی کی مانگ میں مجموعی طور پر ۶٫۷ فی صد سالانہ اضافہ ہوا ہے جس میں گھریلو مانگ ۱۴٫۹ فی صد، کمرشل مانگ ۸٫۳ فی صد، صنعتی مانگ ۶٫۳ فی صد، زراعتی مانگ ۵٫۹ فی صد اور ٹرانسپورٹ میں مانگ ۵٫۸ فی صد کے حساب سے سالانہ اضافہ ہوا ہے۔ یوں مطلق صورت میں توانائی کی مانگ میں اضافہ ۱۳٫۰۱ ملین ٹی۔او۔ای (۸۱/۱۹۸۰ء) سے بڑھ کر

۱۸٫۷۹ ملین ٹی۔او۔ای ہو گیا ہے۔ ان برسوں میں توانائی کی مانگ میں اضافے کی مختلف شرحیں بھی معیشت کے رجحانات کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک طرف گھریلو مانگ میں ۱۴٫۹ فی صد سالانہ اضافہ عام گھریلو صارفین کے مقابلے میں بالائی طبقوں میں پر تعیش زندگی کے رنگ ڈھنگ کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف صنعتی مانگ میں فقط ۶٫۳ فی صد سالانہ اضافہ صنعتی نشوونما کی کم شرح کو ظاہر کرتا ہے۔

(ب) حالانکہ ہمارے ملک میں بجلی کی مانگ کے اندازے ضرورت اور تقاضوں سے بہت کم لگائے جاتے ہیں پھر بھی بجلی کی پیداوار کے جو ہدف طے کئے جاتے ہیں وہ پورے نہیں ہوتے۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں بجلی کی ۴۴۰۰ میگاواٹ اضافی پیداوار کا ہدف طے کیا گیا تھا جو کہ اس ہدف سے کہیں کم رہا اگر یہ ہدف پورا بھی ہو جاتا تو پھر بھی ۱۸۰۰ میگاواٹ بجلی کی کمی رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے آغاز میں (۱۹۸۳ء) جتنی لوڈشیڈنگ تھی اتنی ہی منصوبے کے اختتام پر تھی جو کہ بجلی کی پیداوار کے صلاحیت کے ایک تہائی سے ذرا کم ہے اسی طرح گیس کی لوڈشیڈنگ بھی پیداواری

صلاحیت کا ایک چوتھائی ہے۔ البتہ خام تیل کی گھریلو پیداوار میں کافی اضافہ ہونے کے باوجود یہ خام تیل کی کل مانگ کا ۳۶ فی صد فراہم کرتا ہے اور تیل کی درآمد پر ہمارے زرمبادلہ کا ۳۰ فی صد (۱۹۸۳ء) خرچ آتا ہے جبکہ خام تیل کی عالمی قیمتوں میں کمی کا رجحان رہا۔

(ج) پاور لوڈ شیڈنگ (بجلی و گیس) کے باعث پوری معیشت پر اس کے بالعموم منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ صرف صنعت میں پاور لوڈ شیڈنگ کے باعث سالانہ اضافہ شدہ قدر کے نقصان کا اندازہ ۵۰۰ ملین ڈالر ہے جبکہ نئی سرمایہ کاری میں لوڈ شیڈنگ کے باعث ایک تخمینے کے مطابق ۳۵ فی صد سالانہ کمی واقع ہو رہی ہے۔

(د) توانائی کے شعبے پر اس وقت کل سالانہ ترقیاتی منصوبے کا ۳۸ فی صد خرچ ہو رہا ہے جبکہ بجلی کی بڑھوتری کے لیے سالانہ ترقیاتی منصوبے کا ۲۹ فی صد خرچ کیا جا رہا ہے۔ جو کہ توانائی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ۱۹۹۳ء تک صرف بجلی کی پیداوار میں کم از کم ۶۰۰۰ میگا واٹ اضافے کی ضرورت ہو گی۔ یعنی موجودہ تعداد سے دگنی تاکہ بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کیا جا سکے اس پر ۵.۸ بلین ڈالر کا اضافی خرچہ آئے گا جس میں واپڈا اگر اپنے ریٹ دگنے کرے تو بھی اس کا فقط ۴۰ فی صد پورا کر سکے گا۔ جبکہ بیرون ملک سے توانائی کے شعبے میں عام طور پر ۴۵ فی صد تک سرمایہ کاری کی جاتی رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر پیداواری بجٹ کے مصارف کی بڑی کٹوتی کر کے توانائی کے شعبے میں ضروری سرمایہ کاری نہ کی گئی تو بجلی کا بحران ۱۹۹۳ء میں بھی جاری رہے گا اور پوری معاشی و گھریلو زندگی کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا رہے گا۔

(ط) اگر ضروری ذرائع مہیا کئے جائیں (جو ناکافی ہوں گے) تو بجلی کے بحران پر ہائیڈرو الیکٹرک پاور میں اضافے سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ صرف تربیلا سے سکردو تک ایسے آٹھ مقامات ہیں جہاں سے ۳۰۰۰۰ میگا واٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بھاشا اور داسو کے مقامات پر جن کے متعلق تحقیقات مکمل ہو چکی ہے، ۷۰۰۰ میگا واٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ دریائے سندھ کے علاوہ دریائے جہلم سوات کنہار اور شیاک سے بھی دس ہزار میگا واٹ بجلی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ جہاں تک کالا باغ ڈیم کا متنازعہ مسئلہ ہے، اس کا تعلق فقط توانائی کی پیداوار تک محدود نہیں کیونکہ صوبوں کے درمیان پانی کی منصفانہ تقسیم اور پختون خواہ کے زرخیز اور اہم علاقوں پر اس کے مبینہ مضر اثرات سے بھی براہ راست متعلق ہے۔ علاوہ ازیں کالا باغ ڈیم پر اخراجات کا تخمینہ ۶.۳ بلین ڈالر لگایا گیا ہے۔ حالانکہ اتنی ہی رقم سے اسکردو سے تربیلا تک چھوٹے بندوں کے ذریعے تین گنا بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ غالباً کالا باغ ڈیم میں دلچسپی رکھنے والی کثیر قومی کارپوریشنوں اور عالمی سرمایہ

کاروں اور ان کے حاشیہ بردار کمیشن ایجنٹوں کو یہ منظور نہیں ہے۔

(س) توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کئی برسوں سے ایٹمی توانائی کے استعمال کا سوال ملکی و بین الاقوامی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں جب ان جدید ذرائع پر عالمی اجارہ داری کے کارن تیسری دنیا کے ممالک کو اس سے محروم رکھا گیا ہے۔ پاکستان جیسا پسماندہ ملک جو توانائی کے بڑے وسیلوں سے محروم ہے، کی مستقبل کی نشوونما کے لیے توانائی کے وسیلوں کی توسیع کی ضرورت بڑھتی ہی جائے گی۔ پر امن اور تابکاری کی آلودگی سے محفوظ ایٹمی توانائی کے فروغ کی اہمیت اپنی جگہ موجود ہے اس میدان میں پیش رفت نہ ہونے کے ذمہ دار بعض حکمران جنگ جوئیت پسند حلقے ہیں۔ جن کے پر امن ایٹمی پروگرام کے در پردہ ایٹمی اسلحہ کے حصول کے مہم جویانہ عزائم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ اگر پاکستان انٹر نیشنل نان پرالیفریشن ٹریٹی (INTERNATIONAL NON-PROLIFERATION TREATY) پر دستخط کر دیتا تو اس میدان میں پیش رفت کی جا سکتی تھی۔ مزید برآں پاکستان نے فوجی آمریتوں اور ان کی مہم جویانہ جنگ جوئیت پسندی کے ہوتے ہوئے ایٹمی توانائی کے پر امن پروگرام کے ایٹمی اسلحہ میں بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ اس لیے اس بارے میں ٹھوس اندرونی و بیرونی تحفظات کی سخت ضرورت ہو گا۔ اس وقت بھی ایٹمی پروگرام سویلین کنٹرول کی بجائے براہِ راست فوج کے کنٹرول میں ہے۔

نتائج

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان کی دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی جدید نو آبادیاتی نشوونما جتنی پیچ میل اور بے ترتیبی کا شکار ہے اتنی ہی پیداواری رشتوں کی حالت اور نوعیت بھی گنجلک ہے۔ چونکہ اس دست نگر سرمایہ داری میں کلاسیکل سرمایہ دارانہ ارتقاء کے تکنیکی و تاریخی مراحل پھلانگے گئے ہیں اور کلاسیکل تسلسل کے برعکس، بیک وقت مختلف ترتیب اور متفرق مقداری و صفتی تعلق میں وجود میں آئے ہیں اور عالمی سرمائے سے دست نگر و نواحی سرمائے کے دوہرے جدید نو آبادیاتی رشتوں کے طفیل، سرمائے کے اجتماع کے عمل کی خارجی طور پر متعین EXOGENOUSLY DETERMINED حرکیات DYNAMICS اور نشوونما کے اندرونی عوامل ENDOGENOUS کی مسخ شدہ اور رکی ہوئی ترقی UNDER DEVELOPMENT نہایت متضاد، بے ترتیب اور پیچ میل پیداواری رشتوں کو جنم دیتی ہے۔ نتیجتاً براہ راست

پیداوار کرنے والوں اور تمام افرادی قوت کا طبقاتی نکتہ نظر سے اس عبوری "سماجی نظام پیداوار میں اپنے مقام، ذرائع پیداوار سے رشتے محنت کی سماجی تنظیم میں کردار، اور نتیجتاً سماجی دولت میں حصے کی جہتوں سے جو وہ خرچ کرتے ہیں اور جن طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔" کے مارکسی لیننی پیمانوں پر تعین بھی اس غیر معمولی ABNORMAL نشوونما کے ٹھوس حالات کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں یہ جاننا بہت اہم ہے کہ ہمارے معاشی ڈھانچے کی بدلتی حالت اور سرمائے کے اجتماع کے مخصوص عمل میں یہ کس رخ اور کس نوعیت کی مقداری و صفتی نوعیت میں وجود میں آرہے ہیں اور معاشی ڈھانچے میں ایمپلائمنٹ کی نوعیت کس نوع کی ہے اور ان کے پورے سماج پر کیا مضمرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کارل مارکس نے ٹھوس حالات کے ٹھوس تجزیہ کے ناطے کہا تھا۔

"THE CONCRETE IS CONCRETE, BECAUSE IT IS THE CONCENTRATION OF MANY DETERMINATIONS, HENCE UNITY OF DIVERSE"

(الف) یہ مخصوص سرمایہ دارانہ نشوونما اپنے عبوری وظائف کے باوصف ایک طرف قبل از سرمایہ دارانہ دقیانوسی ڈھانچوں کو نہ صرف یہ کہ جس تیزی سے تباہ کرتی ہے انہیں اس تیزی سے بدلنے کی بجائے اپنے مفاد میں ڈھالتی ہے اور ان میں تبدیلی کا عمل سست رو ہے۔ نتیجتاً سرمائے کے اجتماع کے عمل میں بالعموم ازکار رفتہ آلات پیداوار استحصال کی روایتی صورتیں TRADITIONAL FORMS OF. APPROPRIATION جس میں غیر معاشی جبر کی باقیات بھی شامل ہیں اور دقیانوسی عمل ہائے محنت ARCHIAC LABOUR PROCESSES سرمائے کی توسیعی تجدید پیداوار اور اجتماع کا حصہ بن گئے ہیں۔ جسے مارکس نے سرمائے کے ہاتھوں محنت کی رسمی اطاعت FORMAL SUBSUMPTION OF LABOUR TO CAPITAL قرار دیا ہے۔ اس کا اظہار، زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعت اور وسیع غیر رسمی پیداواری شعبوں کے بہت سے حصوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جوں جوں سرمایہ دارانہ نشوونما آگے بڑھتی ہے۔ نئی سطح پر تجدید پیداوار کے تقاضے بتدریج پسماندہ آلات پیداوار اور دقیانوسی عمل ہائے محنت کو بھی بدلتے جاتے ہیں اور یوں سست روی سے سرمائے کے ہاتھوں محنت کی حقیقی اطاعت وجود میں آتی ہے۔ بالعموم ہمیں زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعت اور غیر رسمی پیداواری شعبوں میں ان کا ملا جلا پراسس اور صورتیں نظر آتی ہیں۔

(ب) نواحی سرمائے کے اجتماع کے عمل میں بالعموم چھوٹے اور بڑے پیمانے پر پیداواری سرمائے کے اجتماع کا عمل براہ راست پیداوار کرنے والے کے ناطے الٹ

تعلق INVERSE RELATION میں وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ نتیجتاً ذرائع پیداوار سے براہ راست پیداوار کرنے والے کی علیحدگی کے باوجود "آزاد محنت کشوں" کا جم غفیر واضح خطوط پر پیداواری عمل کے متعین رشتوں میں جڑ نہیں پاتا اور سرمائے و محنت کے تضاد کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی تشکیل کرنے والے بنیادی طبقوں MAJOR CLASSES مزدور سرمایہ دار کا ڈھانچہ سرمایہ دارانہ نشوونما کے مقابلے میں پچھڑا ہوا رہ جاتا ہے اور یہ متضاد صورت میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک طرف بڑے پیمانے کا صنعتی شعبہ ہے جو متبادل درآمد صنعتی حکمت عملی کے تحت عالمی پیمانوں اور قیمتوں پر وجود میں آیا ہے اس شعبہ میں مستقل سرمائے کی شرح بہت ہی اعلیٰ ہے۔ (سادہ لفظوں میں یہ شدت سرمایہ کا حامل صنعتی شعبہ ہے) اور غیر مستقل سرمائے کی شرح بہت کم ہے۔ لہٰذا سرمائے کی نامیاتی تشکیل کے بلند ہونے کے ناطے جہاں پرولتاریہ کی پیداواری صلاحیت جتنی زیادہ ہے اتنی ہی ان کی تعداد کم ہے۔ لہٰذا بڑے پیمانے کی صنعت جہاں کل صنعتی پیداوار کا ۸ء۷۱ فی صد پیدا کرتی ہے۔ وہاں کل صنعتی ایمپلائمنٹ میں اس کا حصہ فقط ۱ء۱۹ فی صد (۳۰-۱۲۴ء۷) ہے۔ اس شعبہ میں جہاں فی مزدور اوسط سرمایہ کاری مستقل قیمتوں (۱۹۵۹/۶۰ء) پر ۳۶۲۳۰ روپے (۱۹۶۹/۷۰ء/۱۹۶۳/۶۴ء) سے بڑھ کر ۱۸۵۲۳۳ (۱۹۸۰/۸۱ء/۱۹۶۹/۷۰ء) روپے اور موجودہ قیمتوں پر پندرہ لاکھ روپے ہو گئی ہے۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق ۱۹۷۷ء سے بڑے پیمانے کی صنعت میں فی یونٹ سرمایہ کاری کے ناطے روزگار کی فراہمی میں گیارہ فی صد سالانہ کمی واقع ہو رہی ہے۔ ریاستی سیکٹر کے صنعتی شعبے میں پیشگی سرمائے اور مستقل سرمائے کی شرح اور بھی زیادہ ہے اور کل متعین سرمایہ کاری میں پبلک سیکٹر کا حصہ ۷۰ فی صد (۱۹۷۹/۸۰ء) ہونے کے باوجود پروڈکشن ڈویژن کے تحت آٹھ کارپوریشنوں میں کام کرنے والوں کی تعداد صرف ۵۳۴۷۱ (مارچ ۱۹۸۷ء) تھی۔

دوسری طرف چھوٹے پیمانے کی صنعت جہاں مستقل سرمائے کی شرح بہت کم اور غیر مستقل سرمائے کی شرح بہت زیادہ ہے، میں کل صنعتی ایمپلائمنٹ کا حصہ ۹ء۸۰ فی صد (۵۷۰،۱۷،۳۰) ہے۔ سرمائے کا نامیاتی تشکیل کے پچھڑے ہونے، پسماندہ تکنیکی بنیاد اور بہت سی صورتوں میں دقیانوسی طرز ہائے عمل کے کارن کل صنعتی پیداوار میں اس کا حصہ فقط ۲۸ء۲ فی صد ہے۔ مزید برآں چھوٹے پیمانے کی صنعت میں، جہاں اضافہ شدہ سرمائے کی بار آوری کی شرح میں کمی یعنی کم سرمایہ سے زیادہ پیداوار جو ۳۰ء۴ فی صد (۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۰ء) سے کم ہو کر ۲۷ء۱۰ فی صد (۱۹۶۹ء تا ۱۹۸۱ء) ہو گئی ہے۔ جبکہ بڑے پیمانے کی صنعت میں اضافہ شدہ سرمایہ کی بار آوری کی شرح ان ہی سالوں میں ۴ء۳۰ ف

فی صد سے بڑھ کر ۴ء۳۰ فی صد ہو گئی۔ نیز بڑے پیمانے کی صنعت کی سالانہ نشوونما میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اوّل الذکر کی سالانہ نشوونما پانچویں دہائی کی ۴ء۱۵ فی صد سے کم ہو کر ۶ء۷ فی صد (۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۶ء) رہ گئی ہے اور موخر الذکر کی سالانہ نشوونما ۳ء۲ فی صد سے بڑھ کر ۴ء۹ فی صد (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۷ء) ہو گئی ہے۔

مجموعی طور پر جہاں صنعتی شعبہ کا مجموعی داخلی پیداوار میں حصہ ۸ء۱۲ (اڑھائی گنا) بڑھا ہے وہاں کل افرادی قوت میں اس کا حصہ ۷ء۱۵ فی صد سے کم ہو کر ۴ء۱۳ فی صد (۸۶/۱۹۸۵ء) رہ گیا ہے۔ صنعتی نشوونما کا یہ مخصوص ڈھب اسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ صنعتی نشوونما سے ممیز کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنعتی پرولتاریہ کی تشکیل کا عمل، صنعتی سرمائے کے اجتماع سے الٹ تعلق میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اور اگر دوسرے عوامل FACTORS مستقل رہے تو کمی کا یہ رجحان جاری رہے گا۔ بڑے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں سرمائے کے اجتماع اور سرمائے کی نامیاتی تشکیل کی مختلف حالتوں کے بموجب صنعتی شعبہ کے اندر ہمیں دو مختلف رجحان اور نوعیت کے (بعض صورتوں میں ملے جلے) پراسس نظر آئیں گے۔ بڑے پیمانے کی صنعت میں جہاں سرمائے کے ہاتھوں محنت کی "حقیقی اطاعت" اور محنت و سرمائے کا تضاد واضح و متعین پیداواری رشتوں کی صورت میں موجود ہے، میں اضافی قدر زائد کی پیداوار، مزدور کی پیداواری صلاحیت کو بڑھا کر ضروری وقت محنت کم کرنے سے مطلق قدر زائد کی پیداوار میں بدل جاتی ہے۔ لٰہذا جہاں ایک جانب غیر مستقل سرمائے پر خرچ مستقل سرمائے کے حصے میں کم آتا ہے اور دوسری جانب مزدوروں کی اجرتیں ان کی قدر قوت محنت سے زیادہ تر قریب اور بعض صورتوں میں بہتر ہوتی ہیں۔ نتیجتاً محنت کشوں کے بہتر حالات کار اور خاص طور پر مزدوروں کی ایک پرت سے لیبر اشرافیہ پیدا ہوتی ہے اور اصلاح پسندی کے رجحان غالب رہتے ہیں۔ جبکہ چھوٹے پیمانے کی صنعت میں جہاں مستقل سرمائے کی شرح بہت کم اور تکنیکی بنیاد بہت پچھڑی ہوتی ہے اور نتیجتاً یہاں سرمایہ پرانے آلات اور دقیانوسی طرز ہائے محنت کو ہی اپنے مفاد میں استعمال میں لاتا ہے اور غیر مستقل سرمائے کی شرح کے زیادہ ہونے سے نہ صرف یہ کہ سرمائے کی تشکیل کم تر ہوتی ہے بلکہ جتنا سرمائے کا اجتماع یہاں کم ہوتا ہے۔ اس سے الٹا تعلق میں (غیر مستقل سرمائے کے زیادہ ہونے کے باعث) محنت کش طبقے کی تشکیل بڑھے ہوئے پیمانے پر ہوتی ہے چونکہ پیداواری اسکیل بہت چھوٹا ہوتا ہے اور پرانے آلات اور پسماندہ لیبر پراسس پر انحصار زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے مطلق قدر زائد، زائد وقت محنت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا کر دوز کی جاتی ہے اور مستقل سرمائے کی کمی غیر

مستقل سرمائے کو بڑھا کر دور کی جاتی ہے۔ نتیجتاً نہ صرف یہ کہ اس شعبہ میں مزدوروں کی بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں جمع ہو جاتی ہے اور محنت کے بد ترین استحصال، غیر معاشی جبر کی بہت سی صورتوں (جیسے خشت سازی کی صنعت) کے باوجود محنت و سرمائے کا تضاد نہ صرف یہ کہ واضح صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ یہ شعبہ اس تضاد کی شدت کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ جو پہلے ہی نوکر شاہی ضابطوں، کرپشن اور اجارہ داریوں کے ہاتھوں بہت زیادہ دباؤ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعبہ غیر رسمی صورت میں زیادہ پھیل رہا ہے۔

(پ) اس پیچ میل سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی یہ متضاد خصوصیت ہے کہ یہ زراعت کو اس سے قطع نظر کہ بہت سی صورتوں میں مروج دقیانوسی آلات پیداوار و عمل ہائے محنت اور استحصال کی صورتیں کیا ہیں، بنیادی سرمائے کے اجتماع کے وسیع عمل میں کھینچ لائی ہے۔ یہ ایک طرف سادہ اشیائے تجارت کی پیداوار کے ڈھانچوں اور دوسری جانب غیر معاشی جبر کی حامل بہت سی صورتوں کی حامل زرعی پیداوار کے کئی ڈھانچوں اور عناصر کی حکومت و علیحدگی کو ختم کر کے انہیں گردشی سرمائے کے وسیع ترین دائرے میں لاتی ہے اور تیزی سے زوال پذیر دقیانوسی ڈھانچے اور دقیانوسی عمل ہائے محنت نتیجتاً براہ راست پیداوار کرنے والے رسمی طور پر سرمائے کے اطاعت گزار بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب جہاں یہ ڈھانچے بالعموم اشیائے تجارت اور نیم اشیائے تجارت کی (منڈی کے لیے) پیداوار کے حامل ہو گئے ہیں۔ وہاں پرانے پیداواری رشتوں کی باقیات اور دقیانوسی ڈھانچے منتشر ہونے کے ساتھ ساتھ گھٹتے جا رہے ہیں۔ زراعت میں سرمایہ دارانہ فروغ سے سماجی تفریق کو تیزی سے مہمیز لگی ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ فارمنگ میں دیہی پرولتاریہ کی تشکیل کا عمل نہایت کم تر اور غیر مکمل صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ذرائع پیداوار سے براہ راست پیداوار کرنے والے کی بہت سی صورتوں اور بڑے پیمانے پر علیحدگی کے باوجود آزاد محنت کشوں کی تشکیل کا عمل نہایت پچھڑا ہوا اور گنجلک ہے اور بے زمینی، کم زمینی کے نتیجہ میں دیہی آبادی کا جم غفیر دیہی غریبوں اور غریب کسانوں میں بدل رہا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ سرمایہ دار کاشت کار فروغ پا رہے ہیں اور بڑے زمین داروں کے بورژوا بننے کا عمل کافی تیز ہو گیا ہے، حالانکہ وہ غیر معاشی جبر کی بہت سی صورتوں کو اور مزارعین و ہاریوں کو محنت کی یقینی اور مستقل فراہمی کے لیے مختلف شرائط پر برقرار بھی رکھے ہوئے ہے۔

باوجود یہ کہ تین زرعی اصلاحات ہوئیں ان کے ذریعہ حاصل شدہ رقبہ ۱٫۵ ملین ہیکٹرز سے کم تھا اور اس میں بھی زیادہ تر ناقابل کاشت تھا۔ لہٰذا زراعت میں بڑی

زمینی ملکیت کو قائم رکھتے ہوئے سبز انقلاب کی دوہرے پیمانے BIMODAL کی حکمت عملی دراز زرعی ٹیکنالوجی بحوالہ سائز دہ کارکردگی اور سرمایہ کاری و مشین کاری اور سرکاری پالیسیاں زرعی خواص کے حق میں تھیں۔ "سبز انقلاب" جس کا چھٹی دہائی میں زیادہ تر پنجاب سے آغاز ہوا تھا، ساتویں اور آٹھویں دہائی میں پختون خواہ، سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقوں (جہاں آب پاشی کا تھوڑا بہت انتظام ہے، یا پھر مخصوص فصلوں کے ناطے) تک پھیل گیا ہے۔ لیکن اس کے مضمرات، مشین کاری کی نوعیت سطح اور وسعت، سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی (پانی + اعلیٰ پیداواری بیج + کھاد) کے استعمال کی شدت، آب پاشی کے ذرائع اور ان کی سطح اور سرمایہ کاری و قرضہ جات اور منڈی تک رسائی کے ناطے روایتی کسان گزارہ معیشت بڑے زمین داروں و سرمایہ دار کاشت کاروں، امیر کسانوں، درمیانے و غریب کسانوں پر مختلف و متضاد طور پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف صوبوں اور اضلاع میں ہمیں زراعت میں سرمایہ داری کے بہت سے عمومی اور بعض متفرق اور متضاد مظاہر نظر آتے ہیں۔

اندرونی سرمایہ دارانہ منڈی کے سرمایہ دارانہ پیداوار سے زیادہ پھیلاؤ، سبز انقلاب کے ناطے زرعی زمین داروں کے غلبے اور سبز انقلاب کی حکمت عملی کے بڑے زمین داروں اور سرمایہ دار کاشت کاروں کے حق میں ہونے کے نتیجہ میں دیہات میں سماجی تفریق ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ تیزی سے بڑھی ہے۔ حالانکہ ۸۸ فی صد کھیت، ۲۵ ایکڑ تک کے مختلف سائز کے کھیتوں پر مشتمل تھے اور زرعی حیثیت میں افرادی قوت کی بہتات تھی (اور اب بھی ہے)۔ سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی اور مشین کاری، کارکردگی کے حوالے سے، بڑے سائز کے فارموں خاص طور پر ۵۰ تا ۱۵۰ ایکڑ تک کے سرمایہ دار کاشت کاروں اور ۱۵۰ ایکڑ سے زائد کے مالک بڑے زمین دار طبقے کی سرمایہ دارانہ نشوونما کے مفاد میں تھی۔ اسے جاننے کے لیے فقط زراعت کی مشین کاری خاص طور پر ٹریکٹرائزیشن کی نوعیت اور پھیلاؤ کے ناطے مرتب ہونے والے مضمرات کا اندازہ لگا لینا کافی ہوگا۔ فارم میکنائزیشن کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۸۴ فی صد ٹریکٹرز ۳۵ ہارس پاور کے تھے اور صرف ایک فی صد ۲۶ ہارس پاور سے کم تھے اور ٹریکٹرز کے ذریعہ زیر کاشت کل رقبہ کا ۸۷ فی صد بڑے زمین داروں اور سرمایہ دار کاشت کاروں (۵۰ تا ۱۵۰ ایکڑ) کے پاس تھا۔ یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایک ٹریکٹر گیارہ محنت کاروں کی قوت محنت کا متبادل ہوتا ہے۔ پاکستان میں زراعت کی ٹریکٹرائزیشن بہت تیزی سے ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں ملک میں صرف ۲۰۰۰ ٹریکٹرز تھے جو ۱۹۶۸ء تک ۱۸۹۰۹ ہو گئے اور ۱۹۷۵ء میں ان کی تعداد ۳۵٬۱۴۴ ہو گئی۔ ۱۹۷۳ء تک اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ۴۲٬۰۹۴

کسان زمین سے فارغ ہو گئے۔ جو زرعی مزدوروں کی کل تعداد کا ۴۳ فی صد تھا لیکن ۱۹۷۳ء کے بعد سے یہ تبدیلیاں زیادہ سرعت رفتاری سے آئیں۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۳ء کے درمیانی سالوں میں ٹریکٹرائزیشن میں پانچ گنا اضافہ ہوا اور زراعت کے بارے میں نیشنل کمیشن کی رپورٹ (مارچ ۱۹۸۸ء) کے مطابق اس وقت ملک میں کل ٹریکٹرز کی تعداد دو لاکھ ہو گئی ہے اور ٹریکٹرز کے پھیلاؤ کا موجودہ رجحان ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ بارہ برسوں (۲۰۰۰ء) میں یہ چار لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

فقط ٹریکٹرائزیشن کے حوالے سے یہ پیش بینی کی جا سکتی ہے کہ مزارعین وہاری اور غریب و درمیانے کسانوں کی بھاری اکثریت زمین میں اور ذرائع پیداوار سے علیحدہ ہو جائے گی۔ ایک اندازے کے مطابق اگر یہ رجحان جاری رہا تو آئندہ برسوں میں زراعت میں افرادی قوت کی کھپت میں ۷۰ لاکھ افراد کی گنجائش مزید کم ہو جائے گی۔ ٹریکٹرائزیشن کا یہ عمل فقط آب پاشی والے کھیتوں اور علاقوں تک محدود نہیں رہا بلکہ بارانی علاقوں تک پھیل گیا ہے۔ جہاں زراعت میں سرمایہ دارانہ فروغ کے پچھڑے ہونے کے باوجود براہ راست پیداوار کرنے والوں کی کافی بڑی تعداد پرانے رشتوں کے زوال و بحران کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ مزید برآں مشین کاری کا عمل فقط ٹریکٹرائزیشن تک محدود نہیں رہا بلکہ کٹائی، چھٹائی، بوائی (بعض فصلوں کے حوالے سے) بار برداری، آب پاشی (بذریعہ ٹیوب ویل) اور دیگر مشینی و کیمیائی عوامل کے خاصے وسیع پیمانے پر مروج ہو جانے سے ٹیکنالوجی آلات و طرز ہائے محنت تیزی سے بدلتے گئے ہیں جو ظاہر ہے کہ صرف دیسی پیداواری رشتوں میں بڑی تبدیلیوں کا موجب ہیں بلکہ پرانے طرز ہائے محنت سے منسلک محنت کش عوام کی بڑی تعداد کو فارغ بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس کے اہم نتائج درج ذیل برآمد ہوئے۔

(ا) دوہرے پیمانے BIMODAL کی جو زرعی حکمت عملی پاکستان میں اس امید اور زور پر اختیار کی گئی کہ بڑے زمین داروں اور سرمایہ دار کاشت کاروں کے ناطے زرعی سرمایہ داری کو جتنا فروغ ملے گا اس کے اثرات نچلی سطح پر بھی مرتب ہوں گے۔ TRICKLING DOWN EFFECT درست ثابت نہیں ہوا بلکہ اس کے دو متضاد اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ ۱۵۰ ایکڑ سے زائد اور ۵۰ تا ۱۵۰ ایکڑ تک کے بورژوا زمین دار طبقوں کے زیر کاشت رقبہ میں ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۸ء کے سالوں میں نصف کے قریب اضافہ ہوا جو انھوں نے مزارعین وہاریوں یا پھر نچلے متوسط مالکوں سے واپس لیا تھا۔ جتنا ان کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہوا اتنا ہی کسانوں اور درمیانے مالکوں کے زیر کاشت رقبہ میں کمی واقع ہوئی اور بٹائی نظام پہلے سے کہیں کم رہ

گیا اور جتنا موجود بھی ہے وہ زمین داروں کے لئے معاشی و غیر معاشی جبر و استحصال کے مواقع کو بڑھاتا ہے۔ نیز سرمایہ دارانہ کاشت کے لئے بندھی بندھائی محنت کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔

(۲) ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۰ء کے سالوں میں ان تبدیلیوں کے نتیجے میں پانچ ایکڑ تک کے غریب کسانوں و دیہی غریبوں میں کافی اضافہ ہوا۔ پاکستان میں کل کھیتوں میں ان کی شرح ۲۸٫۱ فی صد سے بڑھ کر ۳۴٫۱ فی صد ہو گئی جبکہ زیر کاشت رقبہ میں ان کا حصہ جو پہلے ہی کم تھا (۵٫۳ فی صد) اس میں اضافہ ۲ فی صد سے بھی کم ہوا (۷٫۱ فی صد) پنجاب میں ان کے کھیتوں کی تعداد میں اضافہ ۲۶٫۱ فی صد سے بڑھ کر ۳۱٫۷ فی صد جبکہ زیر کاشت رقبہ میں ۴٫۸ فیصد سے بڑھ کر ۶٫۵ فی صد ہوا۔ سندھ میں تعداد میں اضافہ ۱۸٫۸ فی صد سے بڑھ کر ۲۵٫۳ فی صد جبکہ زیر کاشت رقبہ ۴٫۴ فی صد سے بڑھ کر ۶٫۲ فی صد ہو گیا جبکہ رقبہ فقط ۱۲٫۷ فی صد سے بڑھ کر ۱۶٫۵ فی صد ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں غریب کسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا وہاں ان میں کم زمینی پیدا ہوئی ہیں اور سندھ میں بٹائی پر کاشت کرنے والے مزارعین اور ہاریوں کے کھیتوں اور زیر کاشت رقبہ میں علی الترتیب ۲۸ فی صد اور ۲۹ فی صد کمی واقع ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ شرائط زراعت کی نوعیت میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور اس کی نوعیت ماضی کے مقابلے میں کافی بدل گئی ہے اور مزارعین و کسان دوہرے تہرے استحصال کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ بکھر رہے ہیں اور دیہی غریبوں، کھیت مزدوروں اور نیم بے روزگاروں میں بدل رہے ہیں۔ جس سے دیہی غریبوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ جن کے ایک بڑے حصے کی جتنی ذرائع پیداوار سے علیحدگی وجود میں آئی ہے، اتنا وہ آزاد رشتوں سے منسلک نہیں ہو پاتا اور یوں زراعت میں سرمایہ داری کا فروغ جتنا براہ راست پیداوار کرنے والے کو زمین سے فارغ کرتا ہے اتنا انہیں سرمایہ دارانہ رشتے میں نہیں لاتا۔ نتیجتاً ان کی اچھی خاصی تعداد دیہات میں زراعت سے باہر مختلف طرح کے کام کاج یا پھر شہروں اور ایسے قصبوں کا رخ کر رہی ہے جہاں روزگار کے مواقع سرمایہ دارانہ نشو و نما کے مخصوص ڈھنگ کے بموجب پہلے ہی کم ہیں۔

(۳) جہاں تک نچلے درمیانے سکیل کے کھیتوں پر اس سبز انقلاب کے اثرات کا تعلق ہے۔ وہ نہایت منفی رہا ہے۔ بالعموم ان کے زیر کاشت رقبہ میں کمی آئی ہے۔ لیکن یہ متضاد رجحانات کے عبوری دور سے گذر رہی ہے۔ پنجاب میں بالعموم نچلے درمیانے مالکوں میں دوسروں کو زمین ٹھیکے پر دینے کا رجحان ہے۔ جبکہ سندھ میں ان میں دوسروں سے زمین ٹھیکے پر لینے کا رجحان حاوی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ

دارانہ کرایہ داری کا رجحان ہر دو جگہ پر بڑھ رہا ہے۔ لیکن اب سندھ میں بھی بڑے زمین دار ٹھیکے پر دی ہوئی زمین واپس لے رہے ہیں۔

سندھ میں ایک خاص تبدیلی یہ بھی آئی ہے کہ نہ صرف تقسیم ہند کے نتیجہ میں آباد کاری بلکہ بیراجوں کے علاقوں میں نئی زمینوں کی بڑے پیمانے پر پنجابیوں اور دوسرے غیر سندھی لوگوں کو الاٹمنٹ سے سندھ کی زرخیز زمینوں کا ایک بڑا حصہ غیر سندھیوں کے حوالے کر دیا گیا اور کالونائزیشن کا یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔

زرعی پیداواری رشتوں میں ان بڑی تبدیلیوں سے کہیں زیادہ بڑھتی ہوئی سماجی تفریق اور زراعت میں مشین کاری کے مخصوص ڈھب کا یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ جہاں بڑا زمین دار بورژوا زمین دار طبقے میں بدل رہا ہے اور سرمایہ دار کاشت کار یا زرعی بورژواری تشکیل پا چکی ہے، وہاں ان تبدیلیوں کے نتیجے میں مزارعین وہاری، غریب و درمیانے کسان اور نچلے درمیانے مالک کسانوں میں کم زمینی، بے زمینی، بیروزگاری کم روزگاری اور غربت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں دیہی غربا میں اضافہ ہو رہا ہے اتنا دیہی پرولتاریہ کی تشکیل نہیں ہو پا رہی اور بالعموم زرعی شعبہ میں جتنی مشین کاری بڑھ رہی ہے اتنی ہی روزگار کی فراہمی کی صلاحیت کم ہو رہی ہے۔ یعنی زراعت میں بڑے پیمانے کی زرعی سرمایہ داری جتنی زیادہ بڑھ رہی ہے دیہی پرولتاریہ کی تشکیل اس سے کہیں زیادہ کم تر ہے۔ جتنا یہ براہ راست پیداوار کرنے والے کو ذرائع پیداوار سے علیحدہ کرتی ہے۔ اتنا انہیں آزاد محنت کش کے طور پر پیداواری عمل اور رشتوں میں مربوط نہیں کرتی۔

(ت) عالمی سرمائے سے نواحی یا دست نگر سرمائے کے دوہرے جدید نو آبادیاتی رشتے اور دست نگر سرمائے کے اجتماع کے عمل کے پچھڑے ہونے، عالمی قیمتوں کے پیمانوں پر مستقل سرمائے کی اعلیٰ شرح اور پیداواری سرمائے کے سائیکل کی طوالت، صنعتی ڈھانچے کی نحیف بنیاد میں بنیادی صنعت کا شعبہ بڑا پچھڑا ہوا ہے۔ غیر رسمی پیداواری اور غیر پیداواری شعبوں کا پھیلاؤ سرمائے کے اجتماع کے عمل کا محنت کش طبقے کی تشکیل یا ایمپلائمنٹ کے فروغ سے الٹ تعلق، زراعت میں دقیانوسی ڈھانچوں کا تیز زوال اور سست رو تبدیلی اور سرمایہ دارانہ زراعت کے ہاتھوں بیک وقت زراعت کا مجموعی قومی پیداوار اور روزگار میں کم ہوتا ہوا حصہ اور مجموعی طور پر پیداواری شعبوں کی پچھڑی ہوئی بیچ میل نشوونما اور بالعموم پیداواری سرمائے کے میدان کے مقابلے میں گردشی سرمائے کی بے پناہ وسعت کے نتیجے میں تجارت و خدمات کے غیر پیداواری شعبے معیشت پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں (جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا

ہے) اور معیشت و سماج کا واحد حاوی شعبہ بن گئے ہیں۔ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں کالے دھن کی غیر پیداواری معیشت کے غیر رسمی شعبوں کی نشوونما، جس کی دیگر شعبوں کے مقابلے میں نشوونما کی شرح کئی گنا زیادہ ہے اور بیرون ملک کے پاکستانیوں کی بھیجی ہوئی رقوم کے غیر پیداواری مصارف اور معاشرے میں اشیاء پرستی، خاص طور پر سامان تعیش اور نمود و نمائش کے تیزی سے پھیلتے ہوئے کلچر نے خاص طور پر غیر پیداواری شعبوں کو اور بھی مہمیز لگائی ہے۔ چونکہ ریاست کا حد سے زیادہ ترقی یافتہ نوکر شاہی ڈھانچہ اور نوکر شاہی ریاستی سرمایہ داری کا ڈھانچہ بیک وقت ریاستی اقتدار اور حکمران طبقوں کے بلاک میں مرکزی ثالث اور ناظم نظام ڈھانچے کی حیثیت رکھتا ہے اور جتنا اس کا پھیلاؤ زیادہ ہوا ہے۔ اتنا ہی یہ زیادہ تر اپنے غیر پیداواری بھاری بھر کم بوجھ کے ساتھ سماج کی پیداواری نشوونما پر روک بھی لگاتا ہے۔ نیز طویل المدتی منصوبوں اور سماج و معیشت کے لیے ضروری بنیادی مستقل ڈھانچوں کی تشکیل میں پیشگی سرمائے کی شرح بہت زیادہ اور سرمائے کا سائیکل طویل تر ہوتا ہے۔ ریاست کی مفت خوری کے بے حد و حساب بڑھنے، سول و ملٹری، بیوروکریسی کی کرپشن اور بورژواری کے مفت خورے پن کے ساتھ مل کر نہ صرف یہ کہ پیداواری شعبوں کی نشوونما کم تر اور غیر پیداواری شعبوں کی نشوونما برتر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جتنا گردشی سرمائے کا میدان پھیلتا ہے اتنا ہی یہ پیداواری شعبوں کی نشوونما مسخ کرتا ہے اور جتنا پیداواری شعبے سکڑتے ہیں، اتنا ہی گردشی سرمائے کے میدان کو بڑھاوا ملتا ہے۔ نیتجتاً، غیر پیداواری شعبے جتنے حاوی ہوتے جاتے ہیں سماج کی وسیع ترین پرتیں اور طبقات بھی اسی مناسبت سے ان شعبوں کے گرد تشکیل پاتے جاتے ہیں اور جیسا کہ حقائق سے ظاہر ہے کہ تجارت و خدمات کے شعبوں میں کام کرنے والی افرادی قوت، مطلق و اضافی طور پر بڑھ رہی ہے۔ سماجی و طبقاتی سطح پر اس کے تین اہم مضمرات ہیں۔

(الف) خدمات کے شعبوں میں کام کرنے والی افرادی قوت، کل افرادی قوت کا ۱۰ء۱۱ فی صد ہے اور اس کی کل تعداد ۳۰،۷۰،۰۰۰ ہو گئی ہے۔ تجارت سے متعلق متوسط پرتیں، تجارتی بورژوازی اور اجرتی ملازمین کل افرادی قوت کا ۱۱ء۴۰ فی صد ہیں اور ان کی کل تعداد ۳۱،۸۰،۰۰۰ ہے۔ ٹرانسپورٹ اور مواصلات سے منسلک افرادی قوت کل افرادی قوت کا ۴ء۴۲ فی صد اور ان کی کل تعداد ۱۲،۳۰،۰۰۰ ہے۔ بجلی کے شعبہ سے متعلق ایمپلائز جو کل افرادی قوت کا ۰ء۵۲ فی صد ہیں اور ان کی کل تعداد ۱،۴۰،۰۰۰ ہے۔ ان کا زیادہ تر حصہ بجلی کی سرکولیشن اور دیکھ بھال سے متعلق ہے اور بہت محدود حصہ پرولتاریہ میں شامل ہوتا ہے۔ (یہاں تعمیرات کے شعبے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ابھی بھی غیر رسمی

شعبہ ہے۔ اس میں زیادہ تر پرانے لیبر پراسسز ہی چالو ہیں اور زیادہ تر یہ بھی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تجارتی و صنعتی طرز کا شعبہ بنتا جارہا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی پرانے طرز ہائے محنت اور تکنیکی طریقے بدلتے جارہے ہیں۔ خاص طور پر (CONVEYER BELTS) (VIBRATORS) (CRUSHERS) کے بڑھتے ہوئے استعمال سے اس شعبہ میں بھی اس کی نشوونما کے مقابلے میں قوت، محنت کی کھپت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۴ء کے سالوں میں اس شعبہ میں افرادی قوت کی ضرورت میں ۲۰ تا ۳۰ فی صد کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہاں یہ نشاندہی کر دینی ضروری ہے کہ معاشرے میں اجرتی ملازمین کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے اور یہ ۸۰ لاکھ ہو گئے ہیں۔ جو زیادہ تر متوسط پرتوں کی تشکیل کرتے ہیں اور ان کا ایک حصہ پرولتاریہ کی تشکیل کرتا ہے۔ خدمات و تجارت کے شعبوں میں کام کرنے والی کل افرادی قوت کا ۳۲،۵۹ فی صد ہے۔ جبکہ دیہات میں زراعت اور زراعت سے باہر کل افرادی قوت کا ۵۴،۰۱ فی صد کام کرتا ہے۔ تجارت و خدمات کے شعبوں سے منسلک افرادی قوت کی نشوونما کی شرح کہیں زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں بڑے پیمانے کی صنعت اور زراعت میں افرادی قوت کی کھپت میں کمی کا رجحان ہے۔

(ب) تجارت و خدمات کے شعبوں کا پھیلاؤ چھوٹے پیمانے کی زرعی و صنعتی پیداوار کے بڑے پیمانے پر فروغ، تجارت، پیشہ وارانہ شعبوں کی ترقی اور ریاست کے بطور ایمپلائر ڈھانچے کی ہر لحظہ وسعت اور سرمایہ دارانہ پیداوار سے زیادہ سرمایہ دارانہ منڈی کے فروغ کے نتیجہ میں (اور وہ اسباب جو ہم گنوا آتے ہیں کے ناطے) جہاں سوسائٹی میں چھوٹے پیمانے کی پیٹی بورژوا و روایتی ملکیت میں وسیع پیمانے پر بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ وہاں درمیانی پرتوں پیٹی بورژوازی روایتی متوسط طبقوں اور پیشہ ور درمیانہ گروہوں کا ایک بڑا ہجوم وجود میں آیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس نے سوسائٹی کو بالعموم پیٹی بورژوا (جدید روایتی و قدامت پسند) بنا دیا ہے۔ روایتی و جدید متوسط پرتوں اور پیٹی بورژوازی نے سماجی زندگی، سیاست، ثقافت اور ریاست میں ایک اہم اور نہایت موثر عنصر کی حیثیت لے لی ہے۔ مختلف پیمانوں پر ان کے طبقاتی مفادات کا تعین تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ اور بہت سارے عوامل، آئیڈیالوجی، ثقافت و قومیت اور مخصوص نوعیت کے حالات سے بھی بہت متاثر ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی پوزیشن محنت کش طبقات اور بڑے استحصالی طبقات کے درمیان مسلسل اتار چڑھاؤ کی سی حالت میں ہوتی ہے اور ان میں بے پناہ تفریق و امتیازات ہوتے ہیں لہٰذا اتنا ہی سماج میں ان کا کردار بھی مختلف النوع ہے۔ بہرکیف سماجی نشوونما، تاریخی عمل اور

پورے معاشرے کو متوسط پرتیں بے پناہ متاثر کر رہی ہیں۔ (اس کی مزید کیریکٹرئزشین ہم آگے کریں گے)

(ج) اسی نشوونما کا ایک پہلو یہ ہے کہ سوسائٹی میں اعلیٰ متوسط طبقوں اور پرتوں اور بے پناہ ذرائع کے حامل نو دولتیوں اور ایک اپنی نوعیت کی لمپن بورژوازی پیدا ہوتی ہے۔ سرکاری و نجی کرپشن، اسمگلنگ، رشوت، چور بازاری، غبن، کمیشن اور ٹیکس چوری نے ایک متوازی نظام کی حیثیت لے لی ہے۔ ریاستی اداروں میں مقام، اقتدار تک پہنچ لسلیاتی و سماجی روابط اور راتوں رات تقدیر بدلنے کے نت نئے ڈھنگ اس میں اور جان ڈال دیتے ہیں۔ کالے دھن اور غیر رسمی معیشت نے ان اعلیٰ پرتوں کو گزشتہ دس بارہ برسوں میں بہت طاقت ور اور دولت مند گروہ بنا دیا ہے جو بہت اعلیٰ پر تعیش رہن سہن اور زندگی کے عیش پرستانہ رنگ ڈھنگ کا حامل ہے۔

مالی خسارہ ۔ حقیقی بحران کا بیگانہ اظہار

جنرل ضیاء الحق کی دست نگری کی جدید نوآبادیاتی معاشی حکمت عملی، ورلڈ بینک، عالمی مالیاتی فنڈ کی شرائط قرضہ جات اور ہمہ طرفہ پالیسیوں کے باوجود (اور کارن) ملک گہرے مالی بحران کی زد میں آگیا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کی اعلیٰ شرح کے ناطے جو دعوے کئے جا رہے ہیں اور جن کا بورژوا پیمانوں پر ہم جائزہ لے آئے ہیں اور معیشت کے حقیقی بحران کو دست نگر معیشت کا دیوالیہ پن اور اس کے مضمرات کے ضمن میں پیش کر چکے ہیں۔ موجودہ مالی بحران یا مالی خسارہ اس کا بیگانہ اظہار ہے۔ یہ فقط معیشت کی پوری بنیاد کا پرتو نہیں بلکہ آمرانہ ریاستی ڈھانچے کی مفت خوری کی انتہا (جسے لینن PARASITIC EXCRACENC OF THE STATE کہتے ہیں) ریاست کے بھاری بھر کم اخراجات قرضوں کی ادائیگی کے بھار اور ملکیت دار طبقوں کی مفت خوری نے اسے جواباً اور زیادہ بگاڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے مالی بحران کی شدت کا اعتراف کرتے ہوئے حقیقت کو چھپانے کی یوں کوشش کی کہ "جائزے" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حقیقی معیشت کا تگڑہ پن جاری ہے۔ لیکن معیشت کی مالیات عظیم مشکلات سے دوچار ہیں۔" حالانکہ یہ گہرے سٹرکچرل بحران کا مالی صورت میں بیگانہ اظہار ہے۔ بجٹ خسارہ پندرہ ارب روپے (۸۱/۱۹۸۰ء) سے بڑھ کر (۸۸/۱۹۸۷ء) میں ۵۷،۷ ارب روپے ہو گیا۔ رواں مالی سال میں مالی خسارے کا اندازہ ۶۷ ارب روپے لگایا گیا ہے۔ لیکن اگر اس کا درست طور پر ممکنہ تخمینہ لگایا جائے تو یہ امکان ہے کہ یہ ۹۴ ارب روپے تک پہنچ جائے گا۔

اس وقت (۸۹/۱۹۸۸ء) مرکزی حکومت کی آمدنی (ریوینیو) ۱۳۰ ارب روپے ہے جبکہ

کل اخراجات ۲۰۴ ارب روپے ہیں۔ آمدنی و اخراجات میں تفاوت ۷۴ ارب روپے کی ظاہر کی گئی ہے۔ (حالانکہ یہ کافی زیادہ ہو جائے گی) ۱۳۰ ارب روپے کی آمدنی پر ریاست کے غیر پیداواری اخراجات ۱۴۴ ارب روپے ہیں۔ جن میں سے اندرونی و بیرونی قرض کی اقساط کی ادائیگی پر ۷۱ ارب روپے، دفاع پر ۵۱ ارب روپے، پاکستان، (یوگوسلاویہ، متحدہ عرب امارات اور عمان کو چھوڑ کر) اپنے کل اخراجات کا ۳۳٫۹ فی صد خرچ کرتا ہے جو کہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ انڈیا ۱۸٫۱ فی صد خرچ کرتا ہے انتظامیہ کی تنخواہیں و الاؤنسز آٹھ ارب روپے ہیں۔ یوں حکومت کی کل آمدنی یعنی ۱۳۰ ارب روپے محض قرض کی ادائیگی (۵۵ فی صد) دفاع اور انتظامیہ پر خرچ ہو جاتی ہے اور غیر ترقیاتی بجٹ کے باقی ۱۶ ارب کے لیے حکومت مزید قرض لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ جبکہ تمام ترقیاتی بجٹ جو اس وقت ۶۰ ارب روپے ہے، اندرونی اور بیرونی قرضوں سے پورا کیا جاتا ہے۔ جس میں بیرونی قرضہ جات کا حصہ ۳۸ ارب روپے اور اندرونی قرضہ جات ۳۲ ارب روپے ہیں۔ قرضوں سے بھی جب کام نہیں چلتا تو خسارے کی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ جو ظاہر ہے قرضوں ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آمرانہ ریاست کا مفت خور ڈھانچہ خاص طور پر فوج و اسلحہ کے اخراجات، قرضوں کا بوجھ اور ریاست کے انتظامی و غیر پیداواری اخراجات ہی نہ صرف یہ کہ تمام آمدنی ہڑپ کر جاتے ہیں بلکہ یہ بوجھ اب کل آمدنی سے ۱۶ ارب روپے بڑھ چکا ہے اور ترقیاتی منصوبے جن پر معیشت کی تمام تر نشوونما کا انحصار ہوتا ہے، کے لیے منفی ۱۶ ارب روپے ہیں۔

ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ حکومت کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں؟

۱۹۸۸/۸۹ء کے بجٹ میں ۹۸ ارب روپے کے ٹیکس عائد کئے گئے۔ جن کا ۸۶٫۶ فی صد حصہ بالواسطہ ٹیکسوں، جس میں کسٹم ڈیوٹی، اقراء سرچارج، ایکسائز ڈیوٹی، سیلز ٹیکس اور قدرتی گیس و پیٹرولیم پر سرچارج شامل ہیں۔ یہ تمام ٹیکس اشیاء پر لگے ہیں اور زیادہ تر عوام سے وصول کئے جاتے ہیں۔ جبکہ براہ راست ٹیکس جو دولت اور آمدنی کے حوالے سے لگتے ہیں، صرف ۱۳٫۴ فی صد ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکمران طبقات ٹیکس دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نیشنل ٹیکسیشن ریفارمز کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۴/۸۵ء میں جو آمدنی ٹیکس سے پوشیدہ رہی وہ ۵۱ ارب روپے تھی اور گزشتہ سالوں میں ٹیکس چوری سے کمائے جو اثاثے وجود میں آئے وہ ۱۸۰ ارب روپے کے تھے۔ براہ راست ٹیکسوں میں بھی ۱۹۸۳/۸۴ء میں کل ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد ۸۸۰٫۸۴۴ تھی جن میں ۶۶ فی صد (۳۲۱٫۲۸۷) کا تعلق ۲۵ ہزار روپے سالانہ آمدنی والے گروپ پر تھا

اور ایسے لوگ جن کی قابل ٹیکس آمدنی ایک لاکھ روپے سے زائد تھی کی کل تعداد ۱۹۸۶/۸۵ء میں صرف ۳۶۱۰ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسوں کا تمام بوجھ صرف عوام پر یا درمیانی آمدنی والے گروپ سے تھا۔ جبکہ استحصالی طبقات کی بڑی تعداد ٹیکس چور ہے۔ مزید برآں یہ امر نہایت سنگین ہے کہ حکومت کی آمدنی معیشت کے کل سائز میں بتدریج کم ہو رہی ہے جو ۱۳٫۵ فی صد (۱۹۸۲/۸۳ء) سے کم ہو کر ۱۰٫۸ فی صد (۱۹۸۶/۸۷ء) رہ گئی ہے۔ جبکہ معیشت کے کل سائز میں حکومتی اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ ۲۲٫۱ فیصد سے بڑھ کر ۲۵٫۶ فیصد ہو گئے ہیں۔ بڑھتے اخراجات اور کم ہوتی ہوئی آمدنی کے یہ متضاد رجحانات ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اہم اور بنیادی تبدیلیاں نہ لائی گئیں تو ملک مالی دیوالیہ پن سے نہیں بچ پائے گا اور یہ سنگین صورت اختیار کرتا جائے گا۔ بجٹ کے مالی خسارہ کو اگر توازن ادائیگی کے خسارہ سے ملا کر دیکھا جائے جو ۴۰۵ ملین ڈالر ۷۸-۱۹۷۷ء سے بڑھ کر ۱۰۵۷ ملین ڈالر ہو گئے ہیں تو معیشت کا کل خسارہ اور بھی سنگین ہو جائے گا۔ عالمی مالیاتی فنڈ کی شرائط کے تحت جب حکومتی اخراجات کو کم کرنے اور آمدنی کے لئے نئے ٹیکسوں کی تجاویز دی گئیں تو ہم نے دیکھا کہ کس طرح ۸۸-۱۹۸۷ء کا جونیجو حکومت کا بجٹ صنعتی و تجارتی بورژوازی نے رد کر دیا اور عوام کے رد عمل سے بچنے کے لئے ۲۴ گھنٹے میں ٹیکس تجاویز واپس لینا پڑیں جبکہ زمیندار بورژوازی ٹیکس ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھی اور فوج کو اپنے اخراجات کم کرنے سے کون مجبور کر سکتا تھا۔ لہٰذا مالی بحران کا بوجھ بتدریج عوام پر ڈالا جا رہا ہے۔ یہ مالی بحران حکمران طبقوں اور گروہوں خاص طور پر ایک طرف صنعتی بورژوازی بورژوا زمیندار طبقوں اور تجارتی بورژوازی اور دوسری طرف سول، ملٹری بیوروکریسی کے مفادات کے مابین اک نئی کشمکش کو جنم دے رہا ہے۔ ۸۹-۱۹۸۸ء کے بجٹ میں ڈاکٹر محبوب الحق نے مالی بحران کا بوجھ اگر ایک طرف عوام پر ڈالا تو دوسری جانب صنعتی و تجارتی بورژوازی کو نئے ٹیکس ضوابط میں باندھنے کی کوشش کی جو ناکام رہی ہے جبکہ ضیاالحق نے زمینداروں کو اسلام کی رو سے زرعی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا تاکہ ایک سماجی حمایت کی اہم بنیاد کو ساتھ رکھا جا سکے۔ عبوری حکومت کے میں ڈاکٹر محبوب الحق نے جن نئی شرائط قرضہ جات سے اتفاق کیا ہے وہ نئی حکومت کو وینزویلا کی طرح کی صورت حال سے دوچار کر سکتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مالی بحران نہ صرف حکمران طبقوں میں اک نئی کشمکش کو جنم دے گا بلکہ عوام پر اس کا بے بہا بوجھ مزید بڑھ جائے گا۔

مفلسی انسانی تنزل، ماحولیاتی تباہی

دست نگر معیشت کا بوجھ سب سے زیادہ محنت کش عوام خاص طور پر دیہی و

شہری غربا پر پڑ رہا ہے وہ نہایت عسرت کے حالات میں تلخ ترین زندگی گذار رہے ہیں۔ انٹر نیشنل فنڈ برائے زرعی ترقی کی تحقیق کے مطابق ۶۳ فیصد دیہی آبادی ناقابل بیان غربت کا شکار ہے جبکہ شہروں میں ۴۸ فیصد لوگ ناداری سے نیچے ہیں۔ آئی ایل او کی تحقیق کے مطابق ۴۵ فیصد خاندانوں کو پاکستان میں ۲۳۰۰۰ ہزار ے CALORIES میسر نہیں ہیں جو کہ جسمانی صحت کے لئے کم از کم ضرورت ہے۔ ۶۲ فیصد آبادی کو پینے کا پانی صاف میسر نہیں جبکہ ۸۴ فیصد کو نکاسیٔ آب کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ نتیجتاً ۴۰ فیصد اموات ایسی ہیں جو خراب پانی کے باعث وقوع پذیر ہوئی ہے۔ ۱۰ لاکھ سے زائد لوگوں کے پاس کسی طرح کی کوئی رہائش نہیں ہے اور ۸۱ فیصد خاندان ایسے گھرانوں میں رہنے پر مجبور ہیں جہاں اوسطاً ۷ افراد خانہ ڈیڑھ کمرے میں رہتے ہیں۔ خواندگی کا حال تو اور بھی برا ہے ملک کی کل آبادی کا فقط ۲۶ فیصد خواندہ ہے جو پاکستان کو سب سے زیادہ ناخواندہ ملکوں کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔ اسکول میں داخلے کی شرح بھی بہت کم ہے جو اب ۵۰ تک پہنچ گئی ہے ان میں بھی لڑکیوں خاص طور پر دیہات میں لڑکیوں کی شرح بہت کم ہے جو ۶ فیصد ہے۔ جو خواندہ بھی ہیں ان کی اکثریت حقیقی معنوں میں تعلیم سے محروم ہے اور جو تعلیم یافتہ بھی ہیں وہ علم و سائنس کے حقیقی مافیہ سے نابلد ہیں۔
بچوں اور خواتین کی حالت اور بھی دگرگوں اور المناک ہے۔ پاکستان میں ہر سال ایک ہزار میں سے ۱۱۶ نومولود بچے دوران پیدائش یا پیدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی مر جاتے ہیں جبکہ چھوٹے بچوں (پانچ سال کی عمر تک) کی اموات کی شرح ۱۸۰ فی ہزار ہے اور یہ سب ایسی بیماریوں سے مرتے ہیں جو قابل علاج ہیں اور زیادہ تر غریب اور غلیظ ماحول کی پیدا کردہ ہیں ان نونہالوں کے قاتل حکمران طبقے ہیں جو صحت پر مجموعی داخلی پیداوار کا ۱ء۵ فیصد خرچ کرتے ہیں۔ جہاں تک آمدنیوں کا تعلق ہے تو پاکستان میں اوپر کے ۲۰ فیصد کا آمدنی کے اعتبار سے حصہ ۳۹ء۳ فیصد (۶۴-۶۳ء) سے بڑھ کر ۴۶ء۷ فیصد (۸۵-۸۴ء) ہو گیا ہے جبکہ نچلے ۲۰ فیصد آمدنی کی اتنی ہی ہے جتنی کہ ۱۹۷۹ میں تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ۲۰ امراء فیصد کی آمدنی اگر ۴۵ء۵ فیصد تھی تو ۲۰ فیصد غربا کی آمدنی ۴ء۷ تھی جو وسیع سماجی و طبقاتی تضادات کو ظاہر کرتی ہے۔ معاملہ یہیں تک محدود نہیں روزگار کے مواقع (جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں) روز بروز کم ہو رہے ہیں۔ جبکہ ہر سال ۱۰ لاکھ افراد کو روزگار کی ضرورت ہے۔

پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں انسانی تنزل تک ہی معاملہ محدود نہیں بلکہ ماحولیاتی تباہی بھی ہو رہی ہے۔ انٹر نیشنل یونین آف کنزرویشن آف نیچر ان پاکستان کی ورکشاپ رپورٹ کے مطابق "پاکستان میں گذشتہ پندرہ بیس سالوں میں ماحولیاتی

تنزلی تیزی سے ہوئی ہے۔" بارانی علاقوں میں ۲۵ فیصد رقبہ تباہی کی نذر ہو چکا ہے جبکہ زیر آبپاشی رقبے کا ہر سال ۴۰ ہزار ہیکٹر ناقابل کاشت ہوتا جا رہا ہے۔ اب تک سیم کے ہاتھوں ۲۱ ملین ہیکٹر زمین بری طرح سے متاثر ہو چکی ہے اور ۴۰۲ ملین ہیکٹر زمین تھور سے متاثر ہوئی ہے۔ جس سے تقریباً ۳۰۵ ملین کی آبادی بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ اسی طرح دریاؤں کے پانی میں آلودگی کے اضافے اور جنگلات کی تباہی اور شہروں میں آلودگی اور صنعتی علاقوں میں آلودگی سے محفوظ رکھنے کے تحفظات کے بغیر فضا اور زمین آلودگی کی لپیٹ میں آ رہے ہیں۔

اندرونی انتقال آبادی اور شہری آبادی کا تیز پھیلاؤ اور بڑھتی ہوئی کچی آبادیاں

پاکستان میں آبادی کا اضافہ ایشیاء میں سب سے زیادہ ہو رہا ہے۔ آبادی میں اضافہ کی شرح ۳۰۱ فیصد سالانہ ہے۔ دیہات کی آبادی کی شرح میں اضافہ ۲۰۶ فیصد جبکہ شہروں میں ۴۰۴ فیصد ہے۔ دیہات کے مقابلے میں شہری آبادی میں اضافہ زیادہ شدت سے ہو رہا ہے۔ اور ابھی شہری آبادی ناپنے کا پیمانہ بدلے ہوئے حالات میں پرانا ہو چکا ہے۔ اس وقت (۸۸-۱۹۸۷ء) کل آبادی ۱۰۳۰۸۲ ملین ہے۔ جس میں سے ۷۱۰۷۰ فیصد دیہات اور ۲۸۰۳۰ فیصد شہروں میں رہتے ہیں۔ (۸۱-۱۹۵۱ء) کے سالوں میں شہری آبادی میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ شہروں کی آبادی میں جس سطح پر اضافہ ہو رہا ہے اس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ ۳۱ ملین کی شہری آبادی ۲۰۰۰ء سال میں ۵۶ ملین ہو جائے گی۔ شہروں کی طرف آبادی کا یہ انخلاء بنیادی طور پر زراعت کے پرانے دقیانوسی ڈھانچوں کے تیز زوال اور زرعی سرمایہ داری کے فروغ کے کارن ہو رہا ہے۔ جبکہ شہروں کی نشو نما اس زائد آبادی کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ملک کے اندر ہونے والی نقل مکانی کا ۸۷۰۶ فیصد دیہاتوں نے فراہم کیا، جبکہ شہروں سے نقل مکانی فقط ۱۲۰۴ فیصد ہے۔ دیہات سے نقل مکانی کرنے والوں کا ۵۰ فیصد شہروں ہی میں بس رہا ہے۔ لیکن اندرون ملک نقل مکانی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ پسماندہ ترین اضلاع سے باہر کی جانب نقل مکانی سب سے زیادہ ہو رہی ہے۔ اجتماع اور اندرون ملک نقل مکانی کا سب سے زیادہ رخ سندھ کی جانب ہے، بین الصوبائی نقل مکانی کا ۵۰ فیصد سندھ اور خاص طور پر کراچی میں جمع ہوا ہے۔

شہروں پر آبادی کے اس بڑھتے ہوئے دباؤ کے نتیجے میں اس وقت شہروں میں کچی آبادیوں کی تعداد ۲۳۲۲ ہے جس کی کل آبادی ۵۵۰۶،۰۰۰ ہے جو شہری آبادی کا ایک چوتھائی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء سال تک کچی آبادیوں کے مکین شہری غربا

کی تعداد شہری آبادی کا ۴۰ فیصد ہو جائے گی۔ اس عمل میں پاکستان تیزی سے شہری آبادی کا ملک بن رہا ہے۔ جس کی ۶۵ فیصد آبادی ۲۶ سال کی عمر سے کم ہے۔ جس طرح شہری آبادی بڑھ رہی ہے اس کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ شہروں میں نئی آبادی کو بسانے اور بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لئے نئی شہری آبادی کو جو نیویارک شہر، لاس اینجلس اور شکاگو کی آبادی کے مساوی ہوگی، بڑے پیمانے پر بنیادی و سماجی ڈھانچے کی تعمیر پر اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ جو کہ ظاہر ہے بہت کم میسر ہوں گے۔ نتیجتاً پہلے سے موجود شہروں پر دباؤ سخت بڑھ جائے گا اور اربنائزیشن کے HAZARDS کے ناطے جو مسئلے شہری زندگی کو آج اجیرن بنا رہے ہیں، وہ زیادہ عام ہو جائیں گے۔

باب سوم

ملکی سیاسی صورت حال - جائزہ سابقہ و موجودہ

پارٹی کی دوسری کانگریس منعقدہ ۱۹۷۵ء سے لے کر تیسری کانگریس کا درمیانی وقفہ ملک کے اندر جمہوریت پسند اور مطلق العنان آمریت پسند قوتوں کے مابین سماجی عمل کے ہر میدان میں بھرپور اور تاریخی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس عرصہ میں پاکستان کے جمہوریت پسند عوام نے انتہائی رجعتی آمریت کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ لیکن عوام کی اس مزاحمت کو منظم کرنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے عمل میں پارٹی بالعموم ناکام رہی اور نہ ہی وہ سیاسی عمل میں کار فرما مختلف سماجی عوامل کا درست تجزیہ کر پائی جس کی وجہ سے وہ عوام کی بڑھتی ہوئی جمہوری امنگوں اور آمریت دشمن شعور کا تخمینہ بھی نہ لگا سکی اور عوام سے کٹی رہی۔ سیاسی عمل کا غلط تجزیہ پارٹی کو مہم جوئی کی طرف لے گیا۔ جس کا مظاہرہ گزشتہ تیرہ سالوں میں کئی دفعہ ہوا۔ یہ صورتحال اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ہم گزشتہ دو دہائیوں کا ازسر نو جائزہ لیں اور مختلف سماجی اوز سیاسی عوامل کی نشان دہی کریں جنہوں نے ان سالوں کی سیاست کے بنیادی خدوخال کو ترتیب دیا۔

۱۹۷۳ء کے آئین والی جمہوریہ کا زوال

اس میں کیا شک ہے کہ ہمارا ملک ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء کے شبِ خون سے قبل کتنے پیچیدہ اور گہرے سیاسی و نظری، سماجی، معاشی اور نفسیاتی و اداراتی بحران سے گذرا۔ حکمران طبقوں کے مفادات کے زبردست ٹکراؤ اور متضاد سیاسی و سماجی عناصر اور قوتوں کی وسیع پیمانے پر محاذ آرائی، مختلف النوع عوامل سے مل کر پارلیمانی ڈھانچے کی حدود سے تجاوز کر گئی اور ۱۹۷۳ء کے آئین والی جمہوریہ کو لے بیٹھی۔ باوجودیکہ حکمران طبقوں کے کثرتِ مفادات MULTIPLICITY OF INTEREST کی آویزش اور درمیانی

پر توں، خاص طور پر پیپتی بورژوازی کے متحارب دھڑوں نے فضا کو کافی مکدر کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے مابین طے پانے والا سیاسی سمجھوتہ آمرانہ قوتوں کو کھل کھیلنے سے روکنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ سیاسی، سماجی اور پارلیمانی ڈھانچے کے بریک ڈاؤن نے سول سوسائٹی پر چھاؤنی کی بالادستی کے قیام کی راہ پہلے ہی ہموار کر دی تھی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ ایسا ہنگامہ خیز ڈرامہ تھا جو ملک کے طویل ترین اور نہایت رجعت پسند ULTRA REACTIONARY مارشل لاء کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ آخر وہ کون سے طاقتور سماجی و معاشی، سیاسی و نظری اور طبقاتی و اداراتی عوامل تھے جو ۱۹۷۳ء کے آئین والی جمہوریہ کے زوال اور جنرل ضیاالحق کی انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسند نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ حکومت کے قیام کا باعث بنے۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی بھرپور کامیابی اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی، تعصب اور جمیعت علمائے اسلام کی کامیابی اور رجعت پسند بنیاد پرست آمریت نواز قوتوں کی شکست سے ملک میں سیاسی قوتوں کے حقیقی توازن کا بھرپور اظہار ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات نے عوام کے اندر جمہوری اور قومی امنگوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا اظہار کیا۔ ان انتخابات نے یہ بھی واضح کیا کہ عوام میں سماجی تبدیلی کی زور دار امنگیں کروٹیں لے رہی ہیں، اور وہ اپنے اظہار کے لیے ایسی قیادت کی طلبگار ہیں جو ان کی آرزوؤں کو زبان فراہم کر سکے۔ لیکن پارٹی کی قیادت اپنی سیاسی لائین کو عوام کے اجتماعی شعور میں اس اضافہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کلیتاً ناکام رہی۔ مزید برآں وہ عوام کے جمہوری حاصلات کے استحکام کے لیے بھی قابل ذکر عمل نہ کر سکی۔ فوجی نوکر شاہی اور موجودہ پاکستان کے حکمران طبقوں نے عوام کے اس جمہوری مینڈیٹ کو تسلیم کرنے اور عوامی لیگ کو اقتدار کی منتقلی سے انکار کیا۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ انتخابات کے نتائج کو تسلیم کر لینے سے نہ صرف یہ کہ مشرقی پاکستان بلکہ مغربی حصے کی چھوٹی قوموں پر ان کا تسلط نہیں رہے گا۔ بلکہ ملک کے محنت کش طبقات بھی اس جمہوری تبدیلی کے ثمرات سے بہرہ ور ہو کر اپنی تنظیم کاری کر سکیں گے۔ چنانچہ بیلٹ کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے بلٹ کی راہ اختیار کی گئی اور مشرقی پاکستان کے عوام کو فوج کشی کے ذریعے کچلنے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔ جس کے نتیجے میں فوجی جنتا اور مقامی رجعت کو ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ فوجی جنتا اور رجعت پسندی کی انتخابات کے بعد یہ دوسری شکست زیادہ ہولناک اور ہمہ گیر اثرات اور نتائج کی حامل تھی۔ آمرانہ قوتوں کی اس ذلت آمیز شکست نے ملک میں قوتوں کے توازن میں فوجی جنتا کو کمزور کیا مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں تبدیل ہو جانے سے معاشی و نظریاتی بحران کو شدید کر دیا۔

جس سے ملک میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ فوجی جنتا اب اس پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ وہ اقتدار پر اپنا غاصبانہ قبضہ بدستور قائم رکھے اور باقی ماندہ پاکستان کی اکثریتی جماعت کو اقتدار کی منتقلی سے انکار کرے۔ چنانچہ فوجی جنتا کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ سیاسی اقتدار پیپلز پارٹی کو منتقل کر دے۔

مسٹر بھٹو کی آزاد خیال بورژوا اصلاح پسند اور پاپولسٹ حکومت پاکستان کی تاریخ کے سب سے سنگین بحران کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آئی تھی۔ ریاستی طاقت کے زبردست بحران، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، جنگ میں فوج کی فیصلہ کن شکست، سول ملٹری بیوروکریسی اور اس کی جارحانہ آئیڈیالوجی کی خجالت اور توازن قوت کے وقتی طور پر آزاد خیال بورژوا پاپولسٹ اور قوم پرست (بلوچستان، پختون خواہ) قوتوں کے حق میں بدل جانے سے آمرانہ قوتیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی تھیں، لیکن جدید نو آبادیاتی ڈھانچہ ویسے ہی موجود تھا، بلکہ پہلے سے زیادہ مرکوز ہو گیا تھا۔ اور وقتی شکست کے باوجود سول ملٹری بیوروکریسی پاور سٹرکچر میں گہرے طور پر پنجے گاڑے ہوئے تھی۔ ENTRENTCHED یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مشرقی پاکستان پر فوج کشی میں مسٹر بھٹو نے فوج کا ساتھ دیا تھا اور اقتدار کے حصول میں فوج کے مضبوط حصے نے ان کی مدد کی تھی۔ انہوں نے فوج کی شکست خوردگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج سے طاقتور جرنیلوں کے دو گروہوں کو نکال باہر کیا اور اس کے کمانڈ سٹرکچر میں بعض رسمی تبدیلیاں کر کے اس پر اپنی گرفت وقتی طور پر مضبوط کر لی تھی اور فوج کے متوازی سویلین معاملات کے لیے فیڈرل سیکورٹی فورس کی تشکیل کر کے خود کو فوج کے سہارے سے ماورا کرنے کی کوشش تو کی لیکن بلوچستان میں فوج کشی کے ساتھ ہی سویلین اور سیاسی معاملات میں فوج کا عمل دخل پھر سے بڑھنا شروع ہو گیا۔ نوکر شاہی کی طاقت توڑنے کے لیے بھی انہوں نے پہلے تیرہ سو افسروں اور ملازمین کو سول سروس سے خارج کیا اور پھر سی ایس پی افسروں کی منفرد و ممتاز حیثیت کو ختم کر کے تمام سرکاری ملازمین کو آل پاکستان یونیفائیڈ گریڈز میں مجتمع کر دیا۔ یہ ریاستی ڈھانچے کو اپنے حق میں رام کرنے کے ایسے بظاہر زور دار لیکن نیم دلانہ اصلاحی اقدامات تھے جس سے مضبوط نوکر شاہی، ڈھانچے کی نوعیت اور اس کا آمرانہ کردار تو نہ بدلا، البتہ نوکر شاہی میں اندر ہی اندر ایک ردعمل جڑیں پکڑتا چلا گیا۔

مسٹر بھٹو کی پاپولسٹ حکمت عملی اور بعد ازاں حکومت میں ان کے نظریاتی لبادے یعنی پاپولسٹ آئیڈیالوجی نے نہایت اثر انگیز کردار ادا کیا تھا۔ لیکن ان کا پاپولزم بہت ہی متضاد نوعیت کا تھا۔ ان کے پاپولزم نے سماج میں موجود طبقاتی کشمکش پر

گہرے لفسیاتی، ثقافتی اور سیاسی اثرات مرتب کئے، ایک جانب مظلوم طبقوں کی وسیع تر تعداد سیاسی جمہوری عمل میں شریک ہو گئی اور ان کی طبقاتی و جمہوری امنگوں کو انگیخت ملی تو دوسری جانب ملکیت دار طبقوں میں بالعموم خوف و شکوک کی فضا گہری ہوئی جس نے بعد ازاں شدید رجعتی ردعمل کی صورت اختیار کر لی۔ قدامت پسندی اور دائیں بازو کی رجعت اور دقیانوسی فکری، ثقافتی ڈھانچوں اور رجحانات کے لیے بھی ان کی آزاد خیالی LIBERALISM سوہان روح تھی۔ ان کی پارٹی جو بورژوا زمیندار طبقوں اور وسیع درمیانی پرتوں کے پیٹی بورژوا ڈیموکریٹک حصوں پر مشتمل تھی، نے تیز انقلابی لفاظی DEMOGOGUEY سے نچلے طبقوں اور درمیانی پرتوں کی طبقاتی و جمہوری امنگوں کو وسیع پیمانے پر ابھارا تھا اور یوں ان کی زور دار حمایت حاصل کی تھی۔ ان کی پاکستانی قوم پرستی۔ ایک جانب اینٹی انڈیا شاونزم اور دوسری جانب تھرڈ ورلڈ ازم پر موقوف تھی۔ جتنی ان کی پارٹی کی طبقاتی بنیاد متضاد اور اس کا پاپولزم خالی خولی لفاظی پر مشتمل تھا اتنا ہی مسٹر بھٹو کی سحر انگیزی CHARISMATIC APPEAL پر اس کا انحصار زیادہ تھا اور جتنا اس جماعت کا انحصار مسٹر بھٹو کے سحر CHARISMA پر تھا اتنی ہی اس کی عوام میں تنظیمی جڑیں کمزور تھیں۔ نتیجتاً مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی کو ریاستی مشینری اور نوکر شاہی پر زیادہ انحصار کرنا پڑا۔

ساتویں دہائی کے آغاز پر ریاستی طاقت کے گھمبیر بحران فوج کی شکست اور توازن قوت کے بدلنے سے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے کہ لبرل بورژوا جمہوری اور قوم پرست قوتیں نئے پاکستان کو جمہوری خطوط پر استوار کر سکتیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی عوامی نیشنل پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے مابین سہ فریقی آئینی سمجھوتے نے بورژوا زمیندار طبقوں کے لبرل بورژوا عناصر قوم پرست خواص کے بہت سے حصوں اور متوسط پرتوں کے وسیع پیٹی بورژوا ڈیموکریٹک حصوں کے درمیان ایک ایسے سیاسی سمجھوتے کی بنیاد فراہم کردی تھی جس سے نہ صرف سیاسی اقتدار میں حکمران طبقوں کی پرانی ترتیب اور پوزیشن بدل گئی بلکہ ملک کو پہلا بورژوا جمہوری اور وفاقی آئین ۱۹۷۳ء بھی میسر آگیا۔ یہ سمجھوتہ ہر دو قوتوں کی متفرق سماجی و طبقاتی و سیاسی اور قومیتی بنیاد کے باوجود آمرانہ قوتوں اور قدامت پسند انتہائی رجعت پسند قوتوں کے مقابلے میں جمہوری وفاقی اور پارلیمانی ڈھانچے کو مستحکم کرنے کی ضروری سماجی و سیاسی استطاعت رکھتا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے بورژوا جمہوری، کم وفاقی اور عملاً سیکولر آئین کی متفقہ منظوری سویلین سوسائٹی کے متحارب و کثرتی مفادات کے مابین اور حکمران طبقوں کے بڑے حصوں کے درمیان ملک کے سیاسی و پارلیمانی ڈھانچے پر اتفاق رائے کو ظاہر کرتی

ہے۔

متوسط پرتوں کے وسیع جمہوری حلقوں، قوم پرست خواص اور عوام الناس کے دباؤ کے نتیجے میں آمرانہ قوتیں مضبوط مرکز یا پنجابی بالادستی کے مفادات انتہائی دائیں بازو کے رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر اس آئین کے بالعموم جمہوری مافیہ کو توکنڈ نہ کر سکے البتہ زیادہ صوبائی خود مختاری کے حوالے سے مظلوم قومیتوں کی امنگیں اور محنت کش عوام کی جمہوری و سماجی مانگیں آئین میں کافی تشنہ رہ گئیں۔

آزاد خیال بورژوا اور قوم پرست خواص جن کی سماجی بنیاد کافی متفرق اور بیچ میل تھی کے مابین یہ سمجھوتہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ ایک طرف قوم پرست قوتیں جہاں زیادہ صوبائی خود مختاری کے لئے مضبوط مرکز سے ٹکراؤ میں آگئیں وہاں دوسری طرف مسٹر بھٹو پنجاب کی بالادستی کے مفادات اور نوکر شاہی اور فوج کے ساتھ اپنے ناتوں اور خود اپنے آمرانہ (AUTHORITARIAN) طرز عمل اور مضبوط مرکز کی جانب گہری رغبت کے بموجب قوم پرست قوتوں کے ساتھ تصادم کی راہ پر چل پڑے نتیجتاً ایک جانب مسٹر بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت کو برطرف کر کے فوج کشی کا راستہ اختیار کیا۔ یوں وہ فوج کے ساتھ گہرے طور پر جکڑ گئے اور آمرانہ راہ پر چل نکلے۔ دوسری جانب قوم پرست قوتیں جو ان کی اتحادی ہو سکتی تھیں غیر جمہوری اقدام کے خلاف لڑاکا مزاحمت کی راہ اختیار کر کے اتنی آگے نکل گئیں کہ بعد ازاں انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسند اور قدامت پسند قوتوں کے ساتھ متحد ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

پاکستان کے کثیر القومیتی حالات میں قومی مسئلہ جمہوری اور آمرانہ قوتوں کے مابین جدوجہد کا اہم ترین نکتہ رہا ہے۔ (AUTHORITARIAN PATH) کے ذریعہ مضبوط مرکز کو مسلط کیا ہے اور اس طرح مرکز میں اقتدار و اختیار کے تمام منبے مرکوز کر کے مظلوم قومیتوں اور محروم علاقوں کو اس سے باہر رکھا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھی آمرانہ اقتدار کے ڈھانچے کی جانب سے مظلوم بنگالی لوگوں کی قومی اور جمہوری مانگوں اور حقوق سے جابرانہ انکار پر ہوئی تھی۔

بعد از بنگلہ دیش پاکستان میں بھی مرکز اور قومی وحدتوں کے مابین اختیارات اور پاور کی تقسیم اہم مسئلہ تھی اور ایک جمہوری ڈھانچے کی تشکیل مظلوم قوموں کی اختیار و اقتدار میں مساویانہ، رضاکارانہ اور منصفانہ شرکت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جس کے لئے ضروری تھا کہ پاکستان میں آمرانہ اقتدار کے ڈھانچے کی اہم بنیاد مضبوط مرکز کی جگہ ایک جمہوری و منصفانہ وفاق تشکیل دیا جاتا اور قومی وحدتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے کر اقتدار و اختیار کو عدم مرکوز کیا جاتا تاکہ مظلوم قوموں کی جمہوری امنگیں پوری ہو جائیں

اور آمرانہ قوتوں کا زور ٹوٹ جاتا۔ لیکن آزاد خیال بورژوا جمہوری و پاپولسٹ قوتوں جن پر
پنجابی بالادستی اور سول و ملٹری بیورو کریسی کے مفادات حاوی تھے اور قوم پرست
جمہوری خواص جن پر زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری کے ناطے قومی امنگوں کا رنگ
حاوی تھا کہ درمیان طے پانے والے سیاسی سمجھوتے سے جو جمہوری بلاک تشکیل پایا تھا
وہ مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیار و اقتدار کی تقسیم کے مسئلہ پر کشمکش کی نذر ہو گیا۔
مسٹر بھٹو کے آمرانہ رجحانات اور مطلق اختیار (ABSOLUTE POWER) کی روش انہیں
قومی حقوق کے لئے مصر قوم پرست قوتوں سے تصادم کی راہ پر لے گئی اور وہ اپنے ممکنہ
جمہوری اتحادیوں کے خلاف پنجابی بالادستی اور سول، ملٹری بیورو کریسی کے آمرانہ
مفادات کا آلہ کار بن گئے۔ جبکہ قوم پرست قوتیں اپنے قومی حقوق کی بازیابی کے لئے اس
حد تک دوسری انتہا پر چلی گئیں کہ انہیں بعد ازاں انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسند اور
قدامت پسند قوتوں کا اتحادی بننا پڑا جن کا قومی مسئلہ پر موقف مسٹر بھٹو سے زیادہ آمرانہ
اور شاؤنسٹ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو جن خواص کے نمائندہ تھے ان کی
جمہوریت پسندی مضبوط مرکز قومی جبر اور سول و ملٹری بیورو کریسی کے آمرانہ دام کی
اسیر تھی اور قوم پرست خواص کی قوم پرستی ابھی سر قبیلی عناصر کی انا پرستی اور کوتاہ
نظری کا شکار تھی۔ یہاں ان موضوعیت پسند اور بائیں بازو کے کمیونسٹوں کے گھاڑپن
کا تو ذکر ہی کیا جو جمہوری ڈھانچے کے استحکام کے مفاد میں آزاد خیال بورژوا جمہوری
پاپولسٹ اور قوم پرست قوتوں کے سیاسی سمجھوتے کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ یہ امر
دلچسپی سے خالی نہیں کہ "قومی جمہوریت" کی علمبردار ہماری پارٹی اور ماؤ ازم کی بڑی
نمائندہ مزدور کسان پارٹی دو مختلف پوزیشنوں اور (ALLIGN MENTS) کے باوجود
"پاپولزم" اور "نیشنل ازم" کے سیاسی سمجھوتہ کے خلاف متحرک ہو گئے۔

بعد از بنگلہ دیش کے پاکستان میں پورا معاشی ریاستی ڈھانچہ سخت دباؤ میں آگیا
تھا۔ مشرقی پاکستان کی دو طرفہ منڈی کے ہاتھ سے نکل جانے پر زائد قدر اور ذرائع اجتماع
کے استحصال کی استحصالی طبقوں میں از سر نو تقسیم دست نگر سرمایہ داری کے ڈھانچے
کو منڈی کی نئی حدود کے مطابق بدلنے (RESTRUCTURE) صنعتی نشوونما کو متبادل
درآمد اشیاء صرف کے صنعتی ڈھانچے سے اگلے مرحلے یعنی بنیادی اور بھاری صنعتی بنیاد
کی طرف پیش رفت کرنے اندرونی منڈی کی وسعت کے لئے زرعی ڈھانچے میں تبدیلیوں
کے علاوہ بھاری بھرکم اور جدید ریاستی ڈھانچے جس کا اب سارا بوجھ مغربی پاکستان کے
ذرائع پر آن پڑا تھا کو برقرار اور ترقی دینے کے لئے ذرائع کو ضرورت تھی۔ اس پر طرہ یہ
کہ مسٹر بھٹو کے پاپولزم نے محنت کش طبقات کی امنگوں اور توقعات میں جتنا اضافہ کیا

تھا اس کی اصلاحی اور سطحی پیمانے پر تشفی کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جانا بھی پاپولزم کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ مسٹر بھٹو نے دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے جدید نو آبادیاتی نشو و نما سے یکسر منہ تو نہ موڑا البتہ انہوں نے ریاستی زرعی سرمایہ داری کی جو اصلاح پسندانہ حکمت عملی اختیار کی اس کے سماجی و معاشی ڈھانچوں پر بہت گہرے مضمرات مرتب ہوئے۔ مسٹر بھٹو کے پاپولزم کا سارا زور بائیس خاندانوں کی سرمایہ دارانہ اجارہ داریوں کو ختم کرنے پر مرکوز تھا۔ انہوں نے ۹ بنیادی صنعتوں کے ۵۳ یونٹوں تمام ملکی بنکوں انشورنس کمپنیوں، شپنگ اور بعد ازاں گھی ملوں کو بھی قومیا لیا۔ نیشنلائیزیشن کا یہ عمل فقط اجارہ داریوں تک محدود نہ رہا بلکہ چھوٹے پیمانے کی قومی اور کاٹیج انڈسٹری تک وسیع کر دیا گیا۔ چھوٹے زرعی صنعتی شعبے سے متعلق فلور ملوں کاٹن جننگ اور ہسکنگ ملز جن کی تعداد تقریباً ۲ ہزار تھی کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا نتیجتاً پرائیویٹ سیکٹر کی سرمایہ کاری جو پہلے مجموعی صنعت کاری کا ۹۳فیصد تھی ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں تھی کم ہو کر ۲۹ فیصد رہ گئی جو نجی سیکٹر کے زبردست سکڑاؤ کو ظاہر کرتی ہے، صنعتی بورژوازی کے زیادہ تر حصوں کو دائیں بازو کی انتہائی رجعت پسندی کی جانب لے گئی۔ مسٹر بھٹو نے ریاستی سرمایہ داری کے ڈھانچے کو ناظم نظام ڈھانچہ کے طور پر بڑے پیمانے پر مضبوط کیا۔ جس کے نتیجے میں پبلک سیکٹر کی صنعتی سرمایہ کاری ۷ فیصد سے بڑھ کر ۷۱ فیصد ہو گئی۔ چونکہ پاکستان کا صنعتی ڈھانچہ متبادل درآمد صنعتکاری کے تحت بلند تر ریاستی تحفظات اور بے پناہ مراعات کے تحت وجود میں آیا تھا اور اس کے باوجود فقط اشیائے صرف کی صنعتوں تک محدود کر دیا تھا اور بورژوازی اپنے مفت خورے پن، غیر صنعتی کردار (NON ENTREPRENEURSHIP) اور ناپختگی کے باعث بنیادی اور بھاری صنعت کاری سے اجتناب کرتی رہی تھی۔ مسٹر بھٹو نے بھاری اور بنیادی صنعتوں کے فروغ کے لئے ریاستی شعبے میں اسٹیل ملز مشین سازی اور کھاد و دیگر کیمیائی کارخانوں میں طویل المدتی سرمایہ کاری کی۔ ان کے ان اقدامات سے پبلک سیکٹر نے ملکی معیشت میں لیڈنگ کردار ہی نہیں بلکہ معیشت میں ہمہ طرف کردار بھی اختیار کرایا۔ اس پالیسی کے ثمر بعد ازاں برآمد ہونے تھے لیکن خاص طور پر قومیائی گئی صنعتوں کے مالکان جن میں بڑے اجارہ دار سرمایہ دار اور چھوٹے پیمانے کی صنعتی بورژوازی کے کافی حصے شامل تھے اور تجارتی بورژوازی کے زرعی تجارت اور کاروبار سے متعلق تھے بھٹو حکومت کے خلاف متحرک ہو گئے اور قدامت پسند قوتوں، خاص طور پر دائیں بازو کے انتہائی رجعت پسندوں، عناصر کے ساتھ متحد ہو گئے۔ محنت کش طبقے کے وسیع ابھار نے بھی صنعتی

اس عرصے میں خطے میں عالمی سامراج کا مفاد اسٹریٹیجیکل STRATEGICALLY ایران میں مرکوز ہو گیا تھا اور پاکستان کی اہمیت خاصی ثانوی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی آیزن ہاور ڈوکٹرین EISEN HOWER DOCTRINE کے بموجب جنوب مغربی ایشیا خاص طور پر خلیج میں ایران ہی علاقائی تھانیدار کا کردار سنبھال سکتا تھا۔ وزیر اثنا تیل کے ہتھیار کے استعمال نے تیل کی معیشتوں کی مالیاتی طاقت کو بے پناہ جلا بخشی تھی۔ لہٰذا مسٹر بھٹو کے دور میں پاکستان کے عالمی معاشی تعلقات خاص طور پر بیرونی امداد/قرض کے ذرائع کافی متنوع ہو گئے۔ انہوں نے ایک جانب شہنشاہ کے ایران سے قریبی تعلقات استوار کیئے تو دوسری جانب اسلامی کانفرنس اور تھرڈ ورلڈ ازم کے ناطے عرب ممالک سے تعلقات کو کافی وسعت دی۔ ہندوستان کے ساتھ ہزار سالہ جنگ کے لعروں اور دمادم مست قلندر کے لعروں کے باوجود انہوں نے شملہ سمجھوتہ کر کے پاک بھارت تعلقات میں ایک نئے دور کے آغاز کی سعی کی۔ سیٹو سنیٹو کے غیر مؤثر ہو جانے، پاکستان کی ان سے رسماً علیحدگی پاکستان کی سامراج کی اسٹریٹیجک مفادات کے لئے اہمیت کے ماند پڑ جانے سے پاکستان ایک جدید نوآبادیاتی مملکت رہنے کے باوجود اتحادیوں میں زیادہ وابستہ اتحادی نہ رہا تھا۔ حالانکہ پاکستان ابھی بھی سامراج کے ساتھ سو بندھنوں میں بندھا ہوا تھا۔ بھٹو حکومت کو جو وقتی اضافی خود مختاری عالمی تعلقات میں حاصل ہوئی اسی کا اظہار مسٹر بھٹو کی خارجہ تعلقات میں نسبتاً آزادی کی صورت میں ہوا۔ اور انہوں نے عرب قوم پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایٹمی طاقت بننے کی مہم جوئی بھی کی۔ جو ظاہر ہے ان کے امریکی سامراج سے تعلقات میں کشیدگی کا باعث بنی، جس کا اظہار ان کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی امریکی کوششوں میں صاف طور پر ہوا۔

مسٹر بھٹو کی حکومت جس پاپولسٹ اور جمہوری ابھار کے دوش پر برسر اقتدار آئی تھی اور بلوچستان پختونخواہ کی قوم پرست قوتوں کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ کے نتیجے میں جو جمہوری ڈھانچہ وجود میں آیا تھا اور ۱۹۷۳ء کا جمہوری وفاقی آئین نافذ ہوا تھا اور ڈیموکریٹک پیٹی بورژوازی اور عوام کے دباؤ کے زیر اثر انہوں نے جو بہت سے جمہوری اور قبول عام (POPULAR) اقدامات کئے تھے اور فوجی اور نوکر شاہی کے بالائی حصوں میں تطہیری عمل کے ذریعے جس طرح انہوں نے آمرانہ قوتوں کو وقتی طور پر کمزور کر دیا تھا وہ جلد ہی ان کی متضاد پالیسیوں میکیا ویلینن طریقوں سخت آمرانہ (AUTHORITARIAN) رجحانات اور ریاستی طاقت و نوکر شاہی پر زیادہ انحصار کی نذر ہو گئے۔ ریاستی طاقت کے بحران، سماجی اتھل پتھل اور طبقہ داری کشمکش سے مسٹر بھٹو کو جو اضافی خود مختاری حاصل ہو گئی تھی وہ انہیں نیو بوناپارٹ ازم کی جانب لے گئی اور ان کی حکومت بتدریج

پاپولسٹ جمہوری آزاد خیال بورژوا حکومت سے پاپولسٹ آمرانہ نیو بوناپارٹسٹ ریپبلیکن حکومت میں بدلتی چلی گئی۔ عوامی امنگوں کو ابھار کر اور غیر مطمئین چھوڑ کر اور ریاست کی طاقت سے گلیوں کی طاقت کو کچلنے اور نوکر شاہی پر زیادہ سے زیادہ انحصار بڑھا کر وہ جلد ہی عوامی حمایت سے دور ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے ایک طرف اگر ۲۲ خاندانوں کی تجارتی و صنعتی اجارہ داریوں کو توڑا تو دوسری جانب چھوٹے پیمانے کی صنعتی و تجارتی بورژوازی پر بھی حملہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی محنت کشوں کے گن گائے تو ان کا بھی خون بہایا۔ بڑے زمینداروں کے سرمایہ دارانہ زرعی مفادات کو تقویت بخشی تو ساتھ ہی ان پر زرعی اصلاحات کی تلوار بھی لٹکائے رکھی اور کسانوں کی امنگوں کو پورا کئے بغیر تیز کیا۔ ایک طرف آئینی سمجھوتہ کیا تو تھوڑے عرصے میں نیپ کی صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کا متفقہ جمہوری آئین تشکیل دیا لیکن بعدازاں آمرانہ اختیارات کے لئے اس میں ترامیم بھی کر دیں۔ بنیادی جمہوری حقوق بحال کئے لیکن جلد ہی ان کی آمریت پسندی کی نذر ہو گئے اور سیاسی اختلاف رکھنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ محنت کشوں کی تنظیمیں جو اس عرصے میں کافی پھیلیں اور بائیں بازو کی جماعتیں جن میں تھوڑی بہت جان پیدا ہونی شروع ہوئی تھی بھی ان کے عتاب سے محفوظ نہ رہیں۔ خود ان کی اپنی پارٹی کے انقلابی جمہوری عناصر بھی ان کے غضب کا شکار ہو گئے۔ مذہبی جماعتیں یا دائیں بازو کی تنظیمیں یا قوم پرست قوتیں سب ہی ان کے جارحانہ طرز عمل کے باعث اینٹی بھٹو محاذ پر متحد ہونے پر مجبور ہو گئے۔

غرض بھٹو کی معاشی و سماجی، اور سیاسی پالیسیوں نے معاشرے میں ہلچل کو کافی تیز کر دیا اور سماجی ڈھانچوں کا بحران جو ویسے بھی ہماری سماجی ساخت کے مستقل عارضہ ہے کافی بڑھ گیا۔ خاص طور پر پرائیویٹ سیکٹر اور بالعموم ملکیت دار طبقوں میں بے یقینی اور سماجی رد عمل تیز ہو گیا۔ پاپولزم کی تیز انقلابی لفاظی اور آمرانہ طرز عمل نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ خاص طور پر مسٹر بھٹو کی جدت پسندی اور آزاد خیالی نے رجعتی مذہبی حلقوں کو ان کے خلاف متحرک ہونے کے مواقع فراہم کر دیئے اور ان کے آمرانہ طرز عمل نے بہت سے جمہوری اور قوم پرست عناصر اور قوتوں کو مخالف کیمپ میں دھکیل دیا۔ ایسے میں شہری تجارتی و صنعتی بورژوازی کے وسیع حلقے مسٹر بھٹو کی اصلاح پسندی سے عاجز آکر اپنے تنگ نظر مفادات کے تئیں انتہائی دائیں بازو کی رجعتی جماعتوں کے مذہبی نعروں کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔

مسٹر بھٹو کے پاپولزم اور اصلاح پسندی نے محنت کش عوام کی جمہوری و طبقاتی امنگوں کو جہاں خوب ابھارا وہاں "گلیوں کی طاقت کو ریاستی طاقت سے کچلا" اور عوام الناس

میں اتنا ابھار پیدا نہیں کیا جتنا کہ ملکیت دار طبقوں خاص طور پر پرائیویٹ سرمایہ دار سیکٹر کی انتہائی رجعت کو تیز کر دیا۔ پاپولزم کے لئے عوام کی حمایت اور سماج میں وسیع طبقاتی کشمکش اور اس کے ابتدائی شعور سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوری و سماجی تبدیلیوں کے لئے ہمارے عوام میں کتنی گہری امنگیں ہیں لیکن پاپولزم کا متضاد کردار اور اس کی قیادت کا طبقاتی کردار انہیں نہ منظم کرنا چاہتا تھا اور نہ انہیں منظم کرنا اس کے مفاد میں تھا دوسری جانب پاپولزم کی اصلاح پسندی اور آزاد خیالی کے خلاف وسیع سماجی رجعت کے بڑے پیمانے پر اظہار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں کتنی طاقتور اور وسیع رجعتی سماجی قوتیں ہیں جو معمولی اصلاح پسندی اور روشن خیالی کو گوارہ کرنے کو تیار نہیں۔

پاپولزم اور آزاد خیالی نے نظری، ثقافتی اور سیاسی سطح پر انقلابی لفاظی جدت طرازی اور قبول عام انداز سے زبردست ہلچل پیدا کی۔ پاپولزم کے اس "ثقافتی انقلاب" کے خلاف قدامت پسند مذہبی حلقوں اور انتہائی دائیں بازو کے رجعت پسندوں میں ثقافتی و نظریاتی ردعمل نے جنم لیا۔ اس "ثقافتی نظریاتی ردعمل" یا انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسندی نے تنگ نظر تجارتی بورژوازی، ہنڈی و بازار کے تاجروں، چھوٹے پیمانے کی سرمایہ دارانہ پیداوار سے متعلق سرمایہ داروں پیٹی بورژوازی کے رجعتی گروہوں اور بالعموم پرائیویٹ سیکٹر اور دقیانوسی روائیتی ڈھانچوں سے متعلق خواص کو ایک محاذ میں متحد کر دیا۔ بہت سے جمہوری حلقے اور قوم پرست قوتیں بھی اپنے مخصوص مفادات کے تئیں اس رجعتی دھارے میں بہہ گئیں۔ محنت کش طبقہ اور مظلوم طبقات کی جدوجہد کو اس دور میں عظیم ابھار ملا تھا جو ایک طرف بائیں بازو کی انتہا پسندی اور دوسری جانب اصلاح پسندی کا شکار ہو گئی۔ پاپولزم نے جہاں اسے ابھارا تھا وہاں اسے کچلا بھی۔ مظلوم طبقوں میں سیاسی شعور و تحریک جتنا اس دور میں پھیلا اتنا محنت کش طبقہ اور دیگر مظلوم طبقات منظم نہ ہو پائے۔ کمیونسٹ تحریک جو دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی بائیں بازو کی انتہا پسندی اور عقیدہ پرستی کا شکار تھی اور جب بحران اپنے عروج پر پہنچا تو سیاسی تقسیم کے دو قطبوں میں سے کسی کا چناؤ ان کے لئے ایک DILEMMA سے کم نہ تھا۔ لہٰذا ماؤاسٹ یا پارٹی مجرد نعروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ یا پھر بعض گروپس مسٹر بھٹو کے ان کے تئیں "فاشزم" کے خلاف دائیں بازو کی انتہائی رجعت کی نذر ہو گئے۔

حکمران طبقوں کے کثرت مفادات، بورژوازی کے بکھرے ہوئے اور ان مفادات میں کسی سیاسی سمجھوتہ کے فقدان نے سماجی ڈھانچوں کے بحران اور سماجی و سیاسی

افراتفری کو اتنا تیز کیا کہ آئینی اور پارلیمانی ڈھانچہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ استحصالی طبقوں میں محاذ آرائی اور پیٹی بورژوازی اور دقیانوسی سماجی ڈھانچوں کے قدامت پسند حلقوں کے انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسندی اور مسٹر بھٹو کے آمرانہ طرز عمل نے حکمران طبقوں کے مابین کسی سمجھوتے کے امکان کو مخدوش کر دیا۔ جس نے پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے مابین انتخابی محاذ آرائی سے بڑھ کر بڑے تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ جسے ایک طرف قومی اتحاد کے انتہائی دائیں بازو کے رجعت پسند عناصر اور دوسری طرف سول و ملٹری بیوروکریسی کے آمرانہ حلقوں نے جو دوبارہ متحرک اور فعال ہو گئے تھے۔ ایک ایسی نہج پر پہنچا دیا جو نحیف اور کمسن پارلیمانی ڈھانچے کے بس سے باہر تھے۔

سماجی و سیاسی ڈھانچوں کے بحران سے ہم بالعموم یہ بنیادی نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ:

پاکستان میں دست نگر سرمایہ دارانہ سماجی ساخت کی جدید نو آبادیاتی نشو نما اپنے عبوری مرحلے میں اتنی زیادہ بے میل، بے ترتیب اور ناہموار ہے کہ سماجی و معاشی "بنیادی ڈھانچے اور سماج کے سیاسی و نظریاتی" بالائی ڈھانچے، ہموار اور متناسب طور پر ترقی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ ابھی پہلے سے موجود تضادات کا سلسلہ پختہ نہیں ہوتا کہ اگلے مرحلوں کے تضادات کے سلسلے سماجی زندگی میں شد و مد سے عمل دخل کر لیتے ہیں۔ ایک طرف روائیتی ڈھانچوں کا زوال تیزی سے ہو رہا ہوتا ہے اور ان میں تبدیلی اس سرعت سے نہیں ہوتی، دوسری طرف سرمایہ داری حاوی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن تاریخی طور پر ضروری وصف اور وقت سے محروم ہونے کے کارن اس قابل نہیں ہوتی کہ نانیاتی طور پر پختہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کی طرح سماجی نشو نما کے تقاضے پورے کرے۔ سماجی ڈھانچے کے مختلف عناصر سماجی، معاشی، سیاسی، انتظامی، نظریاتی، ثقافتی اور اداراتی جن کا باہم تال میل اور ارتباط معاشرے کی مجموعی اور حقیقی زندگی کی تشکیل کرتا ہے، ایک دوسرے سے ٹکراؤ میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً سماجی ڈھانچوں کا بحران، مستحکم جمہوری اداروں اور مضبوط جمہوری روایات کی عدم موجودگی میں وقفے وقفے سے وسیع پیمانے پر اعلیٰ سطح اور شدت کے سیاسی و سماجی تصادم کو جنم دیتا ہے۔

سماجی ڈھانچوں کے یہ بحران اور سماجی افراتفری، سرمایہ داری کے ترقی یافتہ مرحلے کے مظہر نہیں ہیں بلکہ اس کے ابتدائی مراحل اور بیک وقت کئی مرحلوں کی وقوع پذیری کے بحران کی مظہر ہے۔ یہ بحران ظاہر کرتا ہے کہ بورژوا جمہوری انقلاب ابھی سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر کتنا غیر مکمل ہے اور دست نگر سرمایہ دارانہ نشو نما کتنی زیادہ ناپختہ ہے۔

ہمارا ملک کثیر حکمران طبقوں اور ان کی تنگ نظر ٹکڑیوں کے مابین کشمکش، طبقاتی تضادات کے گوناگوں عمل، قومیتی تضادات کی گنجلک صورتوں اور سماجی ڈھانچوں کے بحران کے ساتھ مل کر، کثیر النوع تضادات سے بھرپور سماجی و معاشی، طبقاتی و نسلیاتی، اور سیاسی و نظریاتی کثرت حالات کا منظر پیش کرتا ہے۔

بھٹو حکومت اور پارٹی موقف

آئیے اب ہم دیکھتے ہیں کہ بھٹو حکومت کے ان چند سالوں میں پارٹی کا کیا موقف رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کا عرصہ پارٹی کے لئے سیاسی عمل میں اپنا مقام بنانے کے لئے ٹامک ٹوئیاں مارنے کا عرصہ ہے۔ پارٹی کی قیادت پیپلز پارٹی کا طبقاتی کردار جانچنے میں ناکام رہی۔ اسے حکمران طبقات کی فاشسٹ اور سامراج نواز جماعت قرار دیا گیا اور ۱۹۷۱ء میں اس کو اقتدار کی منتقلی کو فوجی جنتا کا بالواسطہ اقتدار تصور کیا گیا۔ پارٹی قیادت اپنی تنگ نظری کے باعث بنگلہ دیش کے قیام اور فوجی آمرانہ قوتوں کے ذلت آمیز انجام کے اثرات اور نتائج کا تخمینہ لگانے میں بری طرح ناکام رہی اور ملک میں سول اقتدار کو مستحکم کرنے اور جمہوری حاصلات کے تحفظ کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا۔

آئینی سمجھوتے کی مخالفت محض اس خوف سے کی گئی کہ اگر پیپلز پارٹی، نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کا یہ سمجھوتہ پائیدار ثابت ہوا تو پارٹی کے اتحادی حکمرانوں کے اتحادی نہ بن جائیں چنانچہ اس سمجھوتے کا تیاپانچہ کر کے "اتحادیوں" کو حکمران طبقوں کے انتہائی رجعتی حلقوں کی یو ڈی ایف کا حصہ بن جانے پر مجبور کر دیا گیا۔

بھٹو حکومت نے شملہ معاہدہ، بنکوں و انشورنس کمپنیوں کو قومیانے، بیگانہ سرمایہ پر روک لگانے، سوشلسٹ ممالک سے تعلقات کو فروغ دینے، ملک میں اسٹیل مل، اور دیگر بنیادی صنعت کے قیام، مالیاتی سرمایہ کو اجارہ دار حصوں کے بجائے نئی ابھرتی ہوئی بورژوازی کی طرف موڑنے، متعدد بین الاقوامی معاملات پر آزاد موقف اپنانے، زرعی اصلاحات کے اعلانات، بنیادی اشیائے صرف کے کارخانوں کی قومی ملکیت اور پبلک سیکٹر کو وسعت دینے جیسے اہم اور متعدد مثبت اقدامات کیئے۔ پارٹی نے ان مثبت اقدامات کی تائید کرنے اور انہیں مستحکم اور وسیع کرنے کی لائن اپنانے کے بجائے اس کو سامراج کی کمزوری سے محمول کرنے کی مجہول لائن اپناتی۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی قومیانے کی پالیسی کو ایک رجعتی اور فاشسٹ اقدام سے تعبیر کیا۔

۷۴ میں پی پی لعب مناقشے نے بلوچستان میں مینگل حکومت کی برطرفی، سرحد میں احتجاجاً مفتی محمود حکومت کے استعفے اور بلوچستان میں فوجی کارروائی کی خطرناک

صورتحال اختیار کر لی جس کے ذریعے فوجی جنتا کو سیاسی عمل میں بحالی کے مواقع میسر آئے۔ پارٹی کی قیادت نے اپنی قوت وسائل اور صلاحیتوں سے یکسر چشم پوشی کرتے ہوئے بلوچستان میں مسلح جنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ملک بھر میں بلوچستان کی راہ اپنانے کی لائن اختیار کی۔ یہ مہم جوئی کی یگانہ روزگار مثال تھی۔ اگرچہ پارٹی اس مہم جویانہ لائن پر عمل درآمد کرنے میں کہیں بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ تاہم اس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ قائدین کے ہانپتے کانپتے نرم و نازک ہاتھوں نے خالی بندوق چھوڑ کر ملی ٹنسی کی معراج پالی۔ بلوچستان کی مسلح جنگ کو ملک بھر میں پھیلانے کے ضمن میں پارٹی تین درجن کامریڈوں کا مظاہرہ بسلسلہ یوم بلوچستان کرانے میں البتہ کامیاب رہی۔ اس طرح پارٹی قیادت بلوچستان کی جدوجہد کے ضمن میں اپنا تاریخی فریضہ ادا کر کے سبکدوش ہوئی۔ لیکن درحقیقت اس ضمن میں جو کار نمایاں ان رہنمایان کرام نے انجام دیا وہ نعپ کی قوم پرست قیادت کو جمہوری دھارے سے کاٹ کر رجعتی یوڈی ایف کا حصہ بنانا تھا۔

نعپ کی قوم پرست قیادت جو حکمران طبقوں کے اقتدار سے محروم رجعتی دھڑے سے اتحاد کی طرف فطری طور پر مائل تھی۔ لیکن اگر پارٹی قیادت ایک مثبت اور معروضی نقطہ نظر اپناتی تو وہ نعپ کے دیگر جمہوریت پسندوں کے اشتراک سے نعپ کو یوڈی ایف کا حصہ بننے سے روک سکنے کی پوزیشن کی حامل تھی۔ لیکن پارٹی قیادت "بھٹو فسطائیت" کے مقابلے کے لئے وسیع تر جمہوری محاذ کے نام پر یوڈی ایف کے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ تاہم ۱۹۷۶ء کے جولائی میں جب یوڈی ایف نے کھلم کھلا فوج کو اقتدار سنبھالنے کے لئے آواز دی اور نعپ کی قیادت نے پابندی کے خلاف مقدمے میں پارٹی رہنماؤں کے منیڈیٹ قبول کرنے سے انکار اور یوڈی ایف کی ہدایات پر عمل کرنے پر صاد کیا تو یک لخت پارٹی قیادت کو یوڈی ایف کی رجعت پسندی اور آمریت نوازی نظر آنا شروع ہوئی تاہم اب کافی تاخیر ہو چکی تھی لہٰذا مجبوراً پارٹی نے چہرے بدلنے کی بجائے سماج بدلنا شروع کر دیئے۔

نعپ کی قوم پرست خصوصاً پختون قیادت ما بعد بنگلہ دیش صورت حال میں اقتدار کی پنجاب سندھ ترتیب کے متبادل یعنی پنجاب پختو نخواہ ترتیب کیلئے سرگرمی سے کوشاں رہی۔ اسی کوشش میں حکمران طبقوں کے اقتدار سے محروم رجعتی دھڑوں کے ساتھ یوڈی ایف قائم کیا گیا۔ جس کو کمزور کرنے کیلئے بھٹو حکومت نے ملک دشمنی کے الزام پر نعپ پر پابندی عائد کر دی۔

نعپ پر پابندی اور سپریم کورٹ سے اس کی توثیق کے بعد نعپ کے قوم پرست حلقوں نے این ڈی پی کی بنیاد رکھی جس میں اس کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا کہ

کمیونسٹوں کو اس میں شامل نہ کیا جاسکے۔ این ڈی پی کے قائدین کی کمیونسٹ دشمنی کی بنیادی وجہ ان کا حکمران طبقوں کے انتہائی رجعتی دھڑے سے بڑھا ہوا اشتراک و تعاون تھا۔ جمہوری قوتوں کی کانفرنس کے ذریعے ہر چند پارٹی این ڈی پی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی لیکن وہ مقام و عہدے حاصل نہ کر سکی جو مزدور طبقے کی "نمائندہ پارٹی" کو حاصل ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ جلد ہی قومیتوں کے حقوق اور سامراج دشمنی پر این ڈی پی کی قیادت کے ڈھلمل پن کو الزام دیکر پروگریسو این ڈی پی قائم کرلی گئی جس کو وسیع تر بنانے کی کوششوں کی ناکامی کے بعد نیشنل پروگریسو پارٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔

۱۹۷۱ء سے لیکر ۱۹۷۶ء تک کے عرصے میں پارٹی لعپ میں اپنے "اتحادیوں" کو مضبوطی سے چمٹے رہی انہیں حکمران طبقوں کے اقتدار پر فائز حصوں سے میل ملاپ سے روکنے اور لعپ کے "اتحاد" میں مزدور طبقے کی حیثیت کو منوانے کی لایعنی تگ و دو میں مصروف رہی۔ اس تگ و دو میں پارٹی قیادت نے یکے بعد دیگرے قلابازیاں کھائیں لیکن اس کے باوجود لعپ کے اندر اور اس طرح ملک کے سیاسی عمل میں خود کو اس طرح بحال کرانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس صورتحال کی بنیادی وجہ بنگلہ دیش کے قیام کے موجودہ پاکستان کی ترقی پسند اور جمہوری قوتوں پر اثرات میں مضمر ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام سے جہاں دو قومی نظریہ کی فرسودگی منظر عام پر آئی اور قومی حقوق کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ وہیں ملک کے سیاسی عمل میں ترقی پسند جمہوری قوتیں نئے پاکستان کی سیاسی قوتوں کی ترتیب میں کمزور ہو گئیں۔ کیونکہ پاکستان میں ترقی پسند قوتوں کو مشرقی پاکستان کی مزدور تحریک سے توانائی ملتی تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی میں کمیونسٹ قوت بنیادی طور پر مشرقی پاکستان سے آئی تھی۔ چنانچہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد لعپ میں بھی سیاسی قوت کا توازن تبدیل ہوگیا اور ۱۹۷۲ء میں ولی خان اور عطاءاللہ مینگل "وحدت ملی" کی اصطلاحیں استعمال کرنے لگے تھے۔ پارٹی قیادت اس بدلی ہوئی صورت حال کا ادراک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی بلکہ ماقبل بنگلہ دیش حیثیت پر اصرار کرتی رہی اور اس حیثیت کو حاصل کرنے اور اپنی قوت کو منوانے کیلئے موضوعیت پسندی کی انتہاؤں تک جا پہنچی۔ پارٹی قیادت نے لعپ کی مرکزی کمیٹی میں عددی قوت کے بل پر اپنی من پسند قراردادیں منظور کروالینے کو ہی مزدور طبقے کی سرگرمیوں کا نقطہ امتیاز تصور کر لیا تھا۔ جب کہ وہ خود اس اہل بھی نہیں تھی کہ لعپ میں زبردستی منظور کرائی ہوئی کال پر ملک کے کسی ایک قصبے میں بھی عمل درآمد کر سکے۔ پارٹی کی ناگفتہ بہ صورت حال کی حقیقی وجہ اس کا محنت کش طبقات بالخصوص مزدور

طبقے میں اثر و نفوذ کا نہ ہونا ہے۔ اپنے طبقے جس کی نمائندگی کا پارٹی دعویٰ کرتی ہے سے ہی پارٹی کو ایسی قوت حاصل ہو سکتی ہے جو متحدہ محاذوں میں اس کی حیثیت اور مقام کا تعین کر سکتی ہے۔ اس طبقے کی قوت اور سرگرمی سے ہی پارٹی سیاسی عمل اور اس طرح متحدہ محاذ میں اپنے اتحادیوں کے طرز عمل کو متاثر کر سکتی ہے۔ لیکن پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کا یہ المیہ رہا ہے کہ اس نے محنت کش طبقات کو منظم اور متحرک کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جس کی وجہ سے مزدور طبقہ اور دیگر محنت کش کمیونسٹ تحریک میں منظم نہیں ہو سکے۔ اس صورتحال کی وجہ سے ایک طرف تو ملک کے سیاسی عمل میں مزدور طبقے کی عملی شرکت ممکن نہیں ہو سکی تو دوسری طرف جمہوری محاذوں میں مزدور طبقے کی عدم موجودگی سے ان میں ڈھلمل، موقع پرست قوتوں کو فروغ ملا۔ جمہوری قوتوں کے ساتھ محنت کش عوام کے وسیع تر اتحاد کی تشکیل نہ ہونے کی وجہ سے مزدور طبقے کے فطری اتحادیوں کو قوت کے سرچشمے دوسری طرف نظر آنے لگے۔

پی این اے کے اس فراڈ میں جو ملک میں جمہوری اداروں کی پامالی کے لئے کثیر سامراجی وسائل سے رچایا گیا تھا بہت سے ترقی پسندوں اور جمہوریت پسندوں کو تحریک بحالی جمہوریت نظر آئی اور وہ اس عوام دشمن ریلے میں بہہ گئے۔ اگرچہ پی این اے کے قیام کے ساتھ ہی پارٹی نے درست طور پر اسے ایک سامراجی سازش کے طور پر پہچان لیا تھا لیکن وہ ابھی تک بھٹو حکومت کے کردار کا تعین نہیں کر سکی تھی۔ چنانچہ اس نے اس سازش کے خلاف سول حکومت کا ساتھ دینے اور سامراجی سازش کی مزاحمت کرنے کے بجائے "سامراجی دھڑوں کا عوامی متبادل" مہیا کرنے کی لائن اختیار کی۔ پارٹی نے پی این اے کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لئے وزیراعظم بھٹو کو خط بھی تحریر کیا اور اسے راہ ہدایت بھی تجویز کی۔ مزید برآں چند سو کی تعداد میں پمفلٹ بھی تقسیم کیے گئے۔ لیکن پارٹی عوام کے کسی بھی حصے میں کوئی اثر و نفوذ نہیں رکھتی تھی اس لئے وہ ہاتھی کی یلغار کو نہیں روک سکی۔

جنرل ضیاء الحق کی انتہائی رجعت پسندانہ نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ حکومت

جنرل ضیاءالحق کی فوجی حکومت تجارتی و صنعتی بورژوازی اور دقیانوسی ڈھانچوں سے متعلق خواص و درمیانی پرتوں اور انتہائی دائیں بازو کی رجعت پسند اور ملائیت پسند

قوتوں کے سماجی ردِّعمل کے دوش پر برسرِ اقتدار آئی تھی اور ایک ایسی منتخبہ حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہوئی تھی جسے ایک طرف سماج میں بورژوا زمیندار حلقوں، اعلیٰ و درمیانی متوسط پرتوں اور عوام کے بڑے حصّوں کی حمایت حاصل اور دوسری جانب ریاستی ڈھانچے میں جس کا اثر و رسوخ کمزور ہوجانے کے باوجود کافی موجود تھا۔ عالمی سطح پر بھی بالخصوص خطے کے اہم ممالک سے بھٹو حکومت اچھے مضبوط تعلقات رکھتی تھی۔ لہٰذا ضیا مارشل لاء کو اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے کافی وقت لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ضیا حکومت نے اپنے طویل المیعاد آمرانہ اقتدار کے منصوبوں کے باوجود کافی عرصہ تک بظاہر گومگو کی پالیسی اپنائے رکھی۔ فوجی جنتا نے چند مہینوں میں ریاستی ڈھانچے خاص طور پر فوج میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کیا اور "غیر جانبدار ریفری" کا لبادہ اتار کر احتساب کا ڈنڈہ اٹھایا۔ لیکن اس بار یہ ڈنڈہ فوج کی جانب سے اپنے محسن کے خلاف اٹھا تھا کہ خود فوج ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی دفعہ ۶ کو توڑ کر برسرِاقتدار آئی تھی۔ اس لئے ریاستی طاقت کے بل پر اپنے آمرانہ مقاصد کے حصول اور قانونی جواز کے لئے اس نے عدلیہ کو اپنا آلہ کار بنایا۔ جس نے بھٹو کے مقدمہ قتل میں وہ کام کر دکھایا جو ۴ جولائی کی شب کو نہ ہوسکا تھا اور اس کے ساتھ ہی نظریہ ضرورت کے تحت مارشل لاء کا قانونی جواز بھی حاصل کرلیا۔ لیکن ۱۹۷۳ء کے آئین کو کاغذ کا ٹکڑا قرار دینے کے باوجود اسے معطل رکھنا مجبوری بن گیا اور عدلیہ کو انعام میں پی سی او دیا گیا۔ جس نے عدلیہ کے اسی اختیار کو چھین لیا جسے استعمال کرتے ہوئے ضیاء الحق کی حکومت کو قانونی جواز بخشا تھا۔

ضیاء فوجی آمریت نے اقتدار غصب کرتے وقت نوے دن میں انتخابات منعقد کرانے اور اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ پاکستان میں متعدد جمہوریت پسند اور قوم پرست جو ملی این اے کے فریب کا شکار تھے اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جنرل ضیاء اپنے پیش رو جنرل یحییٰ کی طرح انتخابات کرا کر اقتدار منتقل کردیں گے۔ وہ اس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکے کہ جمہوری اداروں کو پامال کرکے آنے والی فوجی آمریت انتخابات کرانے کے لئے اقتدار نہیں سنبھالتی ہے۔ جنرل ضیا کی سرپرستی میں فوجی جنتا نے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ بھٹو حکومت کے مثبت اقدامات اور عوام کی جمہوری لڑائیوں کے حاصلات کی نفی کے لئے کیا تھا۔ تاکہ سامراجی مفادات، نجی سرمایہ دار شعبے اور سول فوجی نوکر شاہی کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔ چنانچہ قومیانے کے عمل کو ختم کرنے اور اس طرح طفیلی سرمایہ کو بحال کرنے کی سرگرم کوششیں کی گئیں۔ لیکن چونکہ نجی سرمایہ ریاستی سرمایہ کے ثمرات سے مستفید ہو رہا تھا۔ مزید برآں نوکر شاہی کو پبلک سیکٹر کی لوٹ مار میں غالب حصے کی توقع تھی۔ اس لئے ڈی نیشنلائزیشن کا

عمل مکمل نہ کیا جاسکا۔ اگرچہ فوجی جنتا کی حکومت نے نجی سرمایہ کے فروغ کے لئے متعدد مراعات دیں سامراجی سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کے لئے متعدد سہولتیں فراہم کی گئیں، ملک کو درآمدی مصنوعات کی وسیع منڈی میں تبدیل کرنے کی پالیسی اختیار کی گئیں، مزدوروں، طالبعلموں، اور سماج کے دیگر حصوں کی تنظیموں اور سرگرمیوں پر پابندی عائد کی گئیں۔ مزدوروں کو سیاسی عمل میں شرکت سے باز رکھنے کے لئے ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ملتان کے مزدوروں پر بیمانہ تشدد کیا گیا۔ جاگیرداروں، خوانین اور سرداروں کے خلاف کسانوں کی بے چینی کو وحشیانہ طریقے سے کچلا گیا۔ ان تمام کوششوں کا مقصد عوام کے حاصلات کی نفی اور رجعتی آمرانہ اقتدار کو مستحکم کرنا تھا۔

رجعتی فوجی جنتا یہ سمجھتی تھی کہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ پیپلز پارٹی کو سیاسی طور پر ختم کرسکے گی۔ لیکن مذکورہ بالا اقدامات کے باوجود پیپلز پارٹی زیادہ مقبول جماعت کے طور پر ابھر کے سامنے آئی۔ چنانچہ پی این اے کے تمام شرکا بالخصوص لعب کے قوم پرست رہنماؤں نے "پہلے احتساب اور پھر انتخاب" کا مطالبہ کرنا شروع کیا اور فوجی آمریت نے مثبت نتائج کے یقینی ہونے تک انتخابات ملتوی کردئے۔

دریں اثنا قومی اتحاد کی جماعتوں اور نظام مصطفےٰ کی تحریک میں متحرک تمام سماجی سیاسی و نظریاتی قوتیں (ماسوا تحریک استقلال اور این ڈی پی) جنرل ضیاالحق اور اس کے رفقا پر مشتمل فوجی جنتا کی اتحادی بن گئی تھیں تاکہ پاپولزم سے جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے کے ادھار چکائے جاسکیں۔ حکمران طبقوں کی کشمکش اور بدلی ہوئی صف بندی میں جبکہ آمرانہ قوتوں اور بنیاد پرست و دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں میں اتحاد نے واضح شکل اختیار کرلی تھی۔ فوجی نوکر شاہی شاہانہ لیگار کی نے اس میں مرکزی و مطلق کردار اختیار کرتے ہوئے حکمران طبقوں کے مفادات کے بلاک کی ازسر نو تشکیل کی جس میں تجارتی و صنعتی بورژوازی کے مفادات کو فوقیت دینے کے ساتھ ساتھ دقیانوسی ڈھانچوں سے متعلق خواص اور دائیں بازوں کی رجعت پسند درمیانی پرتوں کو خاص اہمیت دی گئی۔ بورژوا زمیندار طبقوں کو جیتنے کے لئے بھی بعض اقدامات کئے گئے جو بعد ازاں کافی بڑھ گئے۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے ایک ہفتہ بعد ہی خود کو فوج سے علیحدہ کرلیا تھا۔ اور ایک ماہ بعد فوج بیرکوں میں واپس چلی گئی تھی اور جلد ہی سویلینائزیشن کا عمل بھی شروع ہوگیا تھا۔ لیکن اس بار فوجی جنتا نہ صرف یہ کہ ریاستی و سیاسی امور میں براہ راست طور پر طویل عرصے کے لئے ملوث ہوگئی بلکہ اسے ابتدا ہی سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا نہ صرف یہ کہ سماج میں آمریت دشمن موثر

قوتوں کی مزاحمت کے باعث ہوا بلکہ مشرقی پاکستان میں شکست اور مسٹر بھٹو کے دور میں غیر مکمل بحالی کے ازالہ کے لئے ریاستی ڈھانچے اور سماج پر اپنی بالا دستی کو بڑھاوا دینے کے لئے سول حکمران طبقوں کی اقتدار میں براہ راست شرکت کو بہت کم تر رکھا۔ اور وہ بھی اس حد تک جس حد تک پاپولزم کا توڑ کرنے کے لئے اس قومی اتحاد والی سماجی و نظری قوتوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا قومی اتحاد کی کابینہ بھٹو کی پھانسی تک ہی چلی۔

یہاں یہ زور دینا ضروری ہے کہ فوجی جنتا دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں کی حمایت کے باوجود ابھی تک پر اعتماد نہ تھی تا آنکہ خطے میں آنے والی زور دار تبدیلوں خاص طور پر انقلاب ثور اور انقلاب ایران نے سامراج کے ساتھ "بھولے ہوئے اتحادی" کے اسٹر ٹیجک رشتوں کو زوردار پیمانے پر بحال کر دیا جنہوں نے ریگن انتظامیہ کے دور میں زیادہ مضبوطی حاصل کرلی۔

یوں عالمی سامراج، علاقائی رجعت پسندوں، آمرانہ قوتوں اور دائیں بازو کی رجعت نے مل جل کر ضیاالحق کی فوجی جنتا کی حکمرانی کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کی۔ فوجی حکومت نے دائیں بازو کی رجعت پسند فضا، جس سے درمیانی پرتوں کے وسیع حصے متاثر تھے، سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "اسلامائزیشن" کا نظریاتی لبادہ اوڑھ لیا اور سویلنیا نائزیشن و انتخابات کو "مثبت نتائج" سے مشروط کر دیا۔ لیکن پہلے بلدیاتی انتخابات کی ناکامی اور فروری ۱۹۸۱ء میں جمہوری قوتوں کی از سر نو صف بندی جو تحریک بحالی جمہوریت کی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوئی نے سویلنیانائزیشن کے عمل کو فقط اتنا بڑھاوا دیا کہ جمہوری قوتوں کے مقابلے میں نامزد صالحین کی مجلس شورٰی ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکمران طبقوں کے اہم حصوں کے نمائندے ریاستی طاقت کے ساتھ اپنے مفادات کے لئے کتنی کم قیمت پر راضی ہوگئے۔ انکی قیمت میں اضافہ ہوا بھی تو ۱۹۸۳ء کی بحالی جمہوریت کی جدوجہد کے طفیل۔

۱۹۸۱ء میں پاکستان کی طویل ترین فوجی آمریت کے خلاف ملک بھر کی سیاسی قوتوں نے جمہوری اداروں کی بحالی کے لئے اس ملک کی تاریخ کے سب سے طویل المدت جمہوری محاذ تحریک بحالی جمہوریت کی تشکیل کی۔ یہ محاذ ایسے نکات پر تشکیل دیا گیا تھا جو مارشل لاء کے خاتمے ۷۳ء کے آئین کی بحالی آزادانہ منصفانہ انتخابات کے انعقاد اور صوبوں کیلئے حقوق پر مبنی تھے۔ ایم آر ڈی کا قیام اس اعتبار سے ایک خوش آئند اور مثبت قدم تھا کہ اس کی موجودگی نے فوجی آمریت کی متشددانہ پالیسیوں کی مزاحمت کی اور پاکستان کے عوام کی جمہوری جدوجہد کو ایک وسیع پلیٹ فارم فراہم کیا۔

ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد تین ادوار سے گذری۔

اوّل: ایم۔آر۔ڈی کی تشکیل سے قبل فروری ۱۹۸۱ء تک کا دور۔

اس دور میں قومی اتحاد کی زیادہ تر جماعتیں ضیاء فوجی آمریت کے ساتھ شامل رہیں۔ پرائیویٹ بوژروا اسیکٹر کے تقریباً تمام حصے اور درمیانی پرتوں کے بڑے حصے آمریت کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ جڑے رہے اور جمہوری تحریک میں پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کی تنظیمیں شامل رہیں جبکہ قومی اتحاد سے منسلک سیاسی قوتیں اسی دور میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں اور درمیانی پرتوں کے کچھ حصے بتدریج جمہوری تحریک کی طرف راغب ہوئے۔ فوجی آمریت کا یہ آمرانہ دہشت گردی کا دور تھا جس میں بعض تنظیموں کو کچلا گیا اور تشدد کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔

دوم: ایم۔آر۔ڈی کے قیام کے بعد کا دور۔

اس دور میں جمہوری قوتوں کی زیادہ واضح صف بندی ہوئی۔ جبر و بندش کے حالات کے باوجود جمہوری قوتوں نے حتی الوسع مزاحمت کی۔ اگست ۸۳ کی ملک گیر جمہوری تحریک جو چار پانچ ماہ جاری رہی میں سیاسی جمہوری عناصر نے سرگرم حصہ لیا۔ تاہم ماسوا سندھی عوام کے دیگر صوبوں میں عوام کی کوئی بڑا سیکشن اس جدوجہد میں شامل نہ ہوسکا۔ جبکہ بلوچوں میں صرف ایک عنصر نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ گو جمہوری تحریک کی قیادت زمیندار بوژروازی اور متوسط پرتوں کے پاس تھی تاہم سندھ کے خصوصاً دیہی عوام کی ملی ٹنٹ شرکت کے نتائج سے خوفزدہ ہو کر زمیندار بوژروازی تذبذب کا شکار ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

۱۹۸۳ کی تحریک سندھی عوام کی جمہوریت سے وابستگی اور قومی حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کی عظیم مثال تھی۔ سندھ کے دیہی علاقوں میں سرمایہ کاری کے عمل نے سندھ کی قومی تشکیل کے عمل کو تیز کیا تھا جس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف سندھی نچلی اور متوسط پرتوں اور پڑھے لکھے باشعور حصوں میں اضافہ ہوا تھا وہیں دیہات سے زمینوں سے بے دخل ہونے والے بیروزگاروں کے جم غفیر نے بھی جنم لیا۔ تیز رفتار معاشرتی ترقی کے نتیجے معاشرے کی طبقاتی تفریق نمایاں ہو رہی تھی۔ عوام کے تاریخی اور قومی شعور میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ مارشل لاء کا لگنا اس پورے عمل کو بند باندھنے کے برابر تھا جس سے ریاستی ڈھانچے میں سندھی عوام کی شرکت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ سندھ کے قومی اور تاریخی شعور نے اس کو قبول نہیں کیا اور سندھی عوام نے اس فسطائی نظام کے خلاف زبردست ردّعمل کا مظاہرہ کیا۔ اس تحریک میں ۸۰۰ لوگ شہید ہوئے اور بعد میں بھی ڈاکوؤں کے نام پر سندھی عوام کو قتل کیا جاتا رہا۔

سوم: انتخابات کے بائیکاٹ کا حربہ

۱۹۸۳ء کی تحریک یہ ظاہر کرتی تھی کہ سماج میں ایسی جمہوری قوتیں وجود میں آگئی ہیں کہ باوجودیکہ وہ توازن قوت بدلنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں اور عوام میں جمود و بے یقینی تھی فوجی جنتا کے لئے سویلین شرکت کو بڑھائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ بھی تبھی ممکن ہوسکا جب سیاست اور سیاسی جماعتوں پر مسلسل پابندیوں، دوسرے لوکل باڈیز انتخابات اور ۸۳ کی جمہوری تحریک کو پورے ملک کے عوام کو متحرک نہ کرسکنے کے باعث ناکامی کے بعد چیف آف آرمی اسٹاف کو ایسے ریفرینڈم کا سہارا لینا پڑا جس میں کل سات فیصد ووٹ پڑے اور اسلام کے نام پر جنرل ضیا کے عہدہ صدارت کی توثیق کرائی گئی۔ البتہ ریفرینڈم میں لوگوں کی مکمل عدم شرکت کے باوجود اسمبلیوں کے انتخابات میں عوام نے ایم آر ڈی کے بائیکاٹ پر کان نہیں دھرا اور بڑے پیمانے پر اس میں شرکت کی۔ اس کی وجہ سے آمریت کو واک اوور مل گیا۔ بائیکاٹ عوام سے کٹ کر کیا گیا جبکہ عوام فوجی آمریت کو ہر شکل میں محدود سے محدود تر کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایم آر ڈی کے بائیکاٹ کے نتیجے میں ایک ایسی غیر جماعتی اسمبلی وجود میں آگئی جو نہ صرف صنعتی و تجارتی بوژروازی اور زمیندار و خواص بلکہ نئے نو دولتیوں اور بیوروکریٹس و ٹیکنوکریٹس کی نمائندہ تھی۔

یوں سویلیانائزیشن کے عمل نے ۸ سال کے خالص فوجی راج کے بعد ضیاالحق کی نیو بوناپارٹسٹ آمرانہ حکومت کو ریپبلکن بازو فراہم کردیا جو پیدا ہی اسی شرط پر ہوا تھا کہ آٹھویں ترمیم کے ناطے اپنے پروانہ موت پر دستخط کردے۔ لیکن حکمران بلاک میں جو نیا رشتہ تشکیل پایا تھا اور اس میں سول حکمران طبقوں کو جتنا حصّہ دیا گیا تھا اس کے تیئں چیف آف آرمی اسٹاف جو پہلے ہی صدر منتخب ہوچکا تھا نیشنل سیکیورٹی کونسل کو ایک مستقل ادارے کی صورت نہ دلوا سکا جس سے ضیاالحق بھی "رفقا" کے بندھن سے آزاد ہوگیا۔ لیکن سویلیانائزیشن کی اپنی DYANMICS تھی جو اسے غیر جماعتی سے جماعتی ایوان کی جانب لے گئیں اور چیف آف آرمی اسٹاف و صدر کے مقابلے میں انتظامی سربراہ و اسمبلی پارٹی کا مرکزہ وجود میں آیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں جنرل ضیاالحق کی نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ حکومت نے آمرانہ ریپبلکن حکومت کے متضاد پراسس کو جنم دیا۔

جنرل ضیاالحق کی انتہائی رجعت پسند حکومت، چھاونی کی سول سوسائٹی پر طویل بالادستی، سامراج سے اسٹریٹیجک رشتوں کی متحرک بحالی، عالمی سرمائے اور عالمی مالیاتی اداروں سے نئے بڑھتے ہوئے رشتے اور خود فوج کے بطور سیاسی ادارہ یا پرٹیورین فوج

کے کردار نے ریاست و سماج پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے جن کا ہم علیحدہ علیحدہ جائزہ لیں گے۔

فرنٹ لائن اسٹیٹ اور طفیلی فوج

پاکستان بننے کے پہلے دس سالوں ہی میں سماجی ترقی کی سطح کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ ریاستی ڈھانچے میں فوجی نوکر شاہی کا سیاسی کردار بڑھتا چلا گیا اور ۱۹۵۸ء کے بعد بار بار کی فوجی کایا پلٹ اور مارشل لاء کے طویل ادوار کے نتیجے میں فوج کے اندر حکمران پریٹورین فوج یعنی حکمران سیاسی ادارے کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ ریاستی ڈھانچے پر جرنیل شاہی کے براہ راست طویل غلبے، چھاؤنی کے ہاتھوں سول سوسائٹی اور اس کے اداروں کی پامالی اور سماجی زندگی کے ہر شعبے میں فوجی سرائیت اور سماج پر اس بھاری بھر کم ڈھانچے کے بوجھ نے ایک طرف سماج و ریاست، معیشت و سیاست اور دوسری جانب فوج کی سماجی بنیاد پر گہرے اثرات مرتب کیئے ہیں۔ اس ضمن میں جنرل ضیا کی رجعت پسند آمریت کا طویل اور تاریک دور خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ملکی دفاع کے نام پر سالانہ قومی بجٹ کے ۳۴ فیصد سے زیادہ وسائل کے غیر پیداواری استعمال نے ملکی معیشت پر ایک ایسا ناقابل برداشت بوجھ اور بحران مسلط کیا ہے کہ جس کے نتیجے میں ملکی دفاع اور سلامتی کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ خاص علاقوں سے فوجی بھرتی کی استعماری پالیسی کے جاری رہنے سے فوجی ادارے پر مکمل پنجابی غلبہ ممکن ہوا ہے۔ اس ادارے میں پختونوں کو بھی نمائندگی حاصل ہے لیکن سندھ اور بلوچستان اس سے قطعی طور پر خارج ہیں۔ اس صورت حال میں طویل جرنیل شاہی راج نے ملک کے اندر قومی مسئلے کو مزید شدت بخشی ہے۔ فوجی ڈھانچے میں قومی نمائندگی کی موجودہ ساخت کو تبدیل کیئے بغیر ملک میں حقیقی فیڈریشن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ انتہائی بھاری بھر کم اخراجات ملکی وسائل سے پورے نہیں ہو سکتے اس لئے جرنیل شاہی میں عالمی سامراج اور خطے بالخصوص رجعت پسند عرب حکمرانوں کے لئے کرائے کی فوج بننے کا رجحان بڑھا ہے۔ ضیا آمریت کے دور میں امریکی سامراج کی طرف سے پاکستان کو فرنٹ لائن اسٹیٹ قرار دیے جانے کے بعد افغان انقلاب کے خلاف کردار، عرب ممالک میں رجعت پسند شیوخ کی حکمرانی کی حفاظت اور امریکی سنٹرل کمانڈ کے ایک حصے کے طور پر رول ادا کرنے کے نتیجے میں جرنیل شاہی نے عالمی سامراج سے اسٹریٹیجک رشتے قائم کئے ہیں۔ اسی دور میں فوج کے جاسوسی کے شعبے یعنی "انٹر سروسز انٹیلی جینس" یا آئی ایس آئی کی داخلی اور خارجی سیاست میں بڑھتے ہوئے رول

نے ریاست کے اندر ریاست کا کردار ادا کیا اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا ڈھونگ رچا کر ضیاء آمریت نے فوجی ادارے کے لئے مستقل سیاسی رول کی بنیاد رکھی جو ضیا الحق کی موت کے بعد بظاہر پس منظر میں چلے جانے کے باوجود پوری طرح برقرار ہے۔

پاکستان میں دست نگر جدید نو آبادیاتی سماجی و معاشی ڈھانچے کے بحران کو نیو بوناپارٹسٹ طریقوں سے حل کرنے کی کوششوں اور عوام کی جمہوری امنگوں کے درمیان ٹکراؤ ملک کی سیاسی زندگی کی اہم خصوصیت بن گیا ہے جس سے ملک کے سیاسی نظام کے مستقبل کا تعین ہوتا ہے۔ دوسری طرف حد سے زیادہ بڑھے ہوئے فوجی اخراجات کا معاشی بوجھ اور ریاست کے مختلف اداروں کے اوپر جرنیل شاہی کی بالادستی اداراتی بحران کا باعث ہے۔

فوج کی طویل بالادستی سے ریاست اور سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی جڑیں پھیل گئی ہیں۔ وفاقی سطح اور صوبائی سول انتظامیہ کی اعلیٰ آسامیوں پر زیادہ تر فوجی افسران ہی متمکن ہیں۔ یہ معاملہ صرف سروسز تک محدود نہیں بلکہ زرعی اور شہری زمینوں کی الاٹمنٹس بہت بڑے پیمانے پر فوجی افسروں کو کی گئی ہیں۔ فوج کے اپنے تعلیم، صحت، انجینئرنگ وغیرہ کے شعبے ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن شاہین فاؤنڈیشن کے تحت سرمایہ کاری کے ادارے علیحدہ ہیں جو نہ صرف فوج کے لئے نوکریوں بلکہ سرمایہ کاری کا ذریعہ ہیں اور سابقہ فوجیوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اسلامائزیشن، اخلاقی پستی، فرقہ واریت اور نظریاتی بحران

گذشتہ عشرے میں ضیا آمریت نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار پوری شدت سے اسلام کے مقدس نام کو اپنے اقتدار کے نظریاتی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ فوج کی ذمہ داری صرف "سرحدوں کی حفاظت" ہی نہ رہی بلکہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی اس کی مذہبی و ریاستی ذمہ داری ٹھہری۔ احتساب کے عمل کے ساتھ ساتھ معاشرے اور ریاست کو مذہبی بنانے کا ملائی ٹھیکہ بھی اسے حاصل ہو گیا۔ لہٰذا ریاستی قوانین، نظام عدلیہ، نظام تعلیم، دینی مدارس اور معاشرے کے ہر شعبے میں بھرپور رجعتی مہم چلائی گئی اور انہیں ایک خاص طرح کے فرقہ وارانہ (وہابی) مذہبی رنگ میں رنگنے کے لئے ہمہ گیر اقدامات کیے گئے۔ قومی اتحاد کی نظام مصطفیٰ والی نظریاتی لہر جو کہ سماجی رجعت کے لئے نظری لبادہ تھا، کو فوجی جنتا نے خوب استعمال کیا اور خاص طور پر درمیانی پرتوں کی

توہم پرستی، مذہبی سادہ لوحی اور قدامت پسندی سے فائدہ اٹھایا۔ تمام طرح کے دینی مدارس، مساجد اور اوقاف کو بڑی رقوم اور مشاہیر کے ذریعے ریاستی ڈھانچے سے منسلک کر دیا اور انہیں سرکاری گریڈ سسٹم کے تحت کر دیا۔ اس ضمن میں جماعت اسلامی اور دیو بندی (وہابی) مکتبۂ فکر کو مرکزی اہمیت دی گئی۔

ایک خاص فرقے (وہابی) فقہ حنفیہ کو اولیت دینے اور دیگر فرقہ وارانہ اقدامات کے ساتھ ساتھ دوسرے فرقوں کی فرقہ واریت کو ایک طرف بڑھایا گیا اور دوسری جانب دبایا گیا۔ خاص طور پر مذہبی اقلیتوں کو بری طرح سے کچلا گیا لہٰذا فرقہ واریت کو بہت زیادہ ہوا ملی۔ فرقوں کی سب سے بڑی کانفرنسیں (سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، رائیونڈ والے احمدی وغیرہ) اس دور میں ہوئیں اور معاشرے میں تیزی سے فرقہ واریت نے جنم لیا۔ اور مختلف فرقوں کا فقہوں کے نفاذ کا زور پکڑ گیا۔ فقہ جعفریہ کا مطالبہ بھی فقہ حنفیہ مسلط کرنے کے ردعمل میں ہوا۔ سواد اعظم، سپاہ صحابہ، سنی فورس، ختم نبوت، شیعہ فرقے کے بنیاد پرست حلقے، جماعت اسلامی کے فاشسٹ دستے، اس عرصے میں پھلے پھولے۔ جبکہ معاشرے میں فرقہ واریت کا عفریت اتنا گہرا سرایت کر گیا کہ جتنے فرقہ وارانہ فسادات ان سالوں میں ہوئے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ فرقہ وارانہ سیاست کے فروغ کے ساتھ ساتھ اپنے فرقوں کی سیاسی جماعتوں میں بھی جان پڑ گئی۔ فرقوں کا معاملہ فقط اندرونی ہی نہیں رہا بلکہ ان کے ناطے اور ڈانڈے دوسرے ممالک سے مل گئے اور ان ممالک خاص طور پر سعودی عرب، ایران، عراق، کے ان فرقوں سے رابطے گہرے ہو گئے جو ان کی باہم رقابتوں کے لئے استعمال میں آ رہے ہیں امریکیوں نے بھی فرقہ وارانہ تنظیموں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا خاص طور پر دائیں بازو کے رجعت پسند مذہبی عناصر کو افغان انقلاب اور علاقے میں رجعت پرستی کے حق میں استعمال کیا اور ابھی سے بنیاد پرستی اور مذہب کے سامراج مخالف رخ لینے کے امکانات کو قابو میں رکھنے کی غرض سے مذہبی تنظیموں میں عمل دخل پیدا کیا۔ فوجی آمریت نے ملاؤں کی بڑی تعداد کو اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے استعمال کیا۔ ملکی قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کے حوالے سے جنرل ضیا نے جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر شریعت محاذ کھڑا کیا جس نے جونیجو حکومت کی آئین میں نویں ترمیم کے مقابلے میں زیادہ بنیاد پرست شریعت بل پیش کیا۔ شریعت بل اور نویں ترمیم زیادہ بنیاد پرست اور مذہبی دباؤ کے زیر اثر لبرل حکومتی حلقوں کے مابین کشمکش کا باعث بھی بن گئی۔ جسے ضیا نے جونیجو حکومت پر دباؤ کیلئے بھی استعمال کیا۔ لیکن جب اندرونی معاملات حل ہو گئے تو شریعت محاذ میں وہ جان نہیں رہی جو ضیا کی نویں ترمیم کی حمایت سے پہلے تھی۔

شریعت بل ہو یا نویں ترمیم یہ ریاست کو مذہبی ریاست بنانے کی کوششیں میں حدود آرڈیننس اور قانون شہادت واضح پور پر خواتین کا انسانی رتبہ کم تر کرنے کے امتیازی قوانین کے طور پر نافذ کیے گئے اور احمدیوں کے خلاف امتیازی قوانین کا نفاذ کیا گیا۔ غیر مسلم اقلیتوں کا حال تو اور بھی دگرگوں ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں خواتین میں بیداری کی لہر بڑھی اور مذہبی اقلیتوں میں اپنے حقوق کے لئے مزاحمت میں اضافہ ہوا۔

چادر اور چار دیواری کی حفاظت اور معاشرے کو پاک صاف کرنے کے مقدس فرائض کو پورا کرنے کا جو بیڑا فوجی آمریت نے اٹھایا تھا اس کے نتیجے میں معاشرے میں اخلاقی و تہذیبی پاکیزگی تو کیا بڑھنی تھی البتہ اخلاقی قدریں، مہذب روایات اور صاف ستھرے انسانی چلن کا بیڑہ ضرور غرق ہو گیا۔ اخلاقی پستی، کرپشن، رشوت ستانی، غبن اور جرائم زندگی کے تمام شعبوں میں بڑے پیمانے پر پھیل گئے۔ اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق ضیا آمریت کے سالوں میں قتل و غارت، ڈکیتیوں و چوریوں اور فرقہ وارانہ فسادات میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ نشے کی لت اتنی پھیلی ہے کہ صرف ہیروئن کے شکار لوگوں کی تعداد چھ لاکھ سے زائد ہو گئی ہے۔ اسلامی کلچر کی مہم کے دوران اخلاقی طہارت پھیلنے کی بجائے بیگانہ ذلیل اور بلیو کلچر نے فروغ پایا اور ہیروئن، مافیا، کرائے کے قاتل گروہ اور کلاشنکوف گروہ پیدا ہوا۔ جہاں تک خرد برد اور غبن کا معاملہ ہے تو ڈاکٹر محبوب الحق کے بقول صرف سرکاری غبن ۴۰ ارب روپے تھا۔ اسلامائزیشن کے ہاتھوں معاشرے کی مہذب روایات اور جمہوری قدروں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ روشن خیالی، ترقی پسند نظریے، جمہوری و سیکولر فکر، اداروں اور تنظیموں کو مارشل لاء کی پابندیوں اور اسلامائزیشن کے رولر تلے کچل دیا گیا۔ لیکن ان سب سے مذہب کو سیاست میں استعمال کرنے کا استحصالی طبقے کا پرانا نسخہ اب قدر کھو چکا تھا اور جمہوری تحریک میں فرقہ واریت اور ملائیت کے خلاف سیکولر رویہ مضبوط ہوا جبکہ حکمران طبقوں کی آئیڈیالوجی کا بحران بڑھ گیا۔

سول سوسائٹی کی تباہی

چھاؤنی کے طویل غلبے تلے سول معاشرے کو جو زوال نصیب ہوا اسے فوجی جنتا نے منصوبہ بند طریقے سے گہرا کیا اور وسعت دی۔ فوجی آمرانہ غلبے کے لئے ضروری تھا کہ سول سوسائٹی کو ذروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ معاشرے کو نہایت تنگ نظر گروہ بندیوں اور فرقہ بندیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لہٰذا جنرل ضیا کے دور میں ایک طرف سیاسی عمل کے قومی میدانوں کو مقفل کر کے معاشرے کو برادریوں، گروہوں، فرقوں

اور لسانی گروہوں میں تقسیم کر کے نہ صرف ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا بلکہ ایک دوسرے کے خلاف محاذ آراء کر دیا گیا۔ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی اس پالیسی کے اہم آلات میں لوکل باڈیز، عشر و زکوٰۃ کمیٹیوں اور ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات تھے۔ ان تمام اداروں کو چھوٹی بڑی لالچوں اور مفادات کے پورے نظام کے ساتھ یوں نتھی کر دیا گیا کہ پبلک آفس اور "عوامی نمائندگی" کے ادارے آمریت کے لیے سماجی حمایت کا آلہ کار بن گئے وہاں یہ مختلف سطح کے خواص اور استحصالی طبقوں کی پبلک آفس کی لوٹ اور اقتدار تک پہنچ کا ذریعہ بن گئے جس سے سیاسی کلچر میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئے دولتی طبقوں کالے دھن اور عوامی نمائندگی کے عہدوں کو لوٹ کا ذریعہ بنانے کے لئے حکمران طبقوں نے انتخابات و سیاست کو اس سطح تک کاروباری بنا دیا کہ مقامی کونسلوں کے انتخابات میں لاکھوں اور قومی اسمبلی کے انتخابات کے اخراجات کروڑوں تک پہنچ گئے۔

جنرل ضیا کی انتہائی رجعت پسند آمریت فقط مارشل لاء کے سخت ضوابط، کالے قوانین، کوڑوں اور ڈنڈے کے زور پر قائم نہیں تھی بلکہ اس آمریت نے سماج میں کمپت، اطاعت گزاری اور آمریت لوازی کے قدامت پسند کلچر کو فروغ دیا۔ اسلامائزیشن کے نام پر اپنے دقیانوسی ڈھانچوں سے متعلق متوسط پرتوں کے وسیع عناصر، قدامت پسند جذبوں و اقدار اور رجعتی قوتوں اور تمام فرقوں کے ملاؤں کی فوج ظفر موج خاص طور پر عوام کے بہت سے حصوں کی ضعیف الاعتقادی اور اطاعت گذار پدر شاہی رویوں کو چالاکی سے استعمال کیا۔ اس عرصے میں متوسط پرتوں کے پھیلاؤ خاص طور پر مشرق وسطیٰ سے بھیجی ہوئی رقوم، انتہاپرستی کے فروغ اور نو دولتیوں کے غیر رسمی معیشت کے میدان نے ضیا طرز کی رجعتی آمرانہ سیاست کے لئے سماجی زمین فراہم کر دی تھی۔

ہر طرح کی عوامی، سماجی، ثقافتی ماس تنظیموں، انجمنوں اور ٹریڈ یونینوں نیز اظہار کے تمام ذریعوں اور پلیٹ فارموں کو اس بری طرح دبایا گیا کہ گزشتہ برسوں میں ملک بھر میں عوامی تنظیموں، ثقافتی و ادبی انجمنوں، فکری و علمی اداروں میں جس بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا تھا ضیاء دور میں وہ سکڑتی چلی گئیں اور بکھر کر رہ گئیں۔ نیز یہ کہ چھٹی اور ساتویں دہائی کے آخری سالوں اور ساتویں دہائی کے وسط تک عوامی فکر و شعور اور سماجی و سیاسی زندگی میں جو نیا جمہوری، عوامی اور بہت سے پہلوؤں کے اعتبار سے ترقی پسند کلچر پیدا ہوا تھا ضیا کی انتہائی رجعت پسند فہم نے اس فکری و علمی اور شعوری پیش رفت اور نہج کو پیچھے دھکیل دیا اور پاپولزم نے باوجودیکہ جمہوری مزاحمت کے میدان

میں اس کا ایک حد تک مقابلہ کیا لیکن بالعموم جمہوری و ترقی پسند فکر کو پیچھے ہٹنا پڑا اور بہت سی صورتوں میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ضیاء دور میں قومی مسئلے کی شدت

فوجی آمریت کے ان گیارہ برسوں میں قومی مسئلہ نے نئی جہتیں، شدت اور پیچیدگیاں اختیار کی ہیں۔ اس دور میں ریاست کے بڑھتے ہوئے کردار کے باعث سماجی و سیاسی ڈھانچے پر سول و ملٹری بیوروکریسی حاوی رہی ہے جس کی مداخلت گزشتہ سالوں میں ہر شعبہ زندگی میں بڑھی ہے۔ چونکہ یہ زیادہ تر پنجاب سے متعلق ہے اس لئے چھوٹی قومیتوں میں اس قومی جبر و نابرابری کے خلاف احتجاج بڑھا ہے۔ اس پنجابی بالا دستی کا مظلوم قوموں کے خلاف سماجی، نظریاتی، معاشی اور سیاسی سطحوں پر جارحانہ اظہار ہوا ہے جس کے رد عمل میں مظلوم قوموں میں حکمران طبقوں کی آئیڈیالوجی اور کلچر سے بیگانگی اور نفرت بڑھی ہے اور خود ریاستی طاقت کا نام نہاد غیر جانبدارانہ کردار بری طرح سے ننگا ہوا۔

ہمارے ملک میں مظلوم قومیتیں سماجی ترقی کی مختلف سطحوں پر کھڑی ہیں جہاں سرمایہ دارانہ قوتیں نئی نئی ابھر رہی ہیں۔ ان قوتوں کے ابھرنے کی وجہ سے ان قومیتوں کے اندر فرسودہ سماجی ڈھانچہ اور اس کی ترجمان سیاسی قوتیں بھی متاثر ہو رہی ہیں اور مختلف طرح کے رد عمل کا شکار ہو رہی ہیں۔ مظلوم قوموں میں بورژوا قوم پرستی کے ابھرنے سے قوم پرستی میں مختلف طبقوں کے رجحانات کا باہم ٹکراؤ بھی بڑھا ہے۔ سندھ میں خاص طور پر ہر طبقے کی قوم پرستی کے رجحان، رہنما اور تنظیمیں ابھری ہیں۔ بلوچوں میں متوسط پرتوں کی قومی پرستی کے ساتھ ساتھ پیٹی بورژوا اور قومی بورژوا رجحانات بھی سامنے آئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں قومی تضادات میں شدت ذرا مختلف پیرائے میں ابھر کر سامنے آئی۔ کیونکہ اب پنجابی واحد اکثریتی بالادست قومیت تھے۔ جبکہ باقی قومیں مجموعی طور پر اقلیت میں بدل گئیں۔ لہٰذا مسٹر بھٹو کے ہاتھوں بلوچستان میں مینگل حکومت کے خاتمے کے بعد سے قوم پرست قوتوں کے سامنے یہ سوال اہم نوعیت اختیار کر گیا کہ فقط سادہ جمہوریت سے نہیں بلکہ قومیتوں کے مابین زیادہ مساوی وفاقی رشتوں یا زیادہ صوبائی خود مختاری کے بغیر ان کے لئے سادہ جمہوریت بے معنی ہوگی۔

اس عرصہ میں سندھ میں قومی مسئلہ نے ماضی کے مقابلے میں کیفیتی اعتبار سے نئی شدت اختیار کی اور قومی مسئلہ فقط لسانی و صوبائی خود مختاری اور منڈی کے سوال سے بڑھ کر اپنی ہی تاریخی دھرتی پر سندھیوں کے قومی وجود کے تحفظ کا نازک سوال بن گیا۔ منڈی پر غیر سندھیوں کے غلبے جو سرمائے کے اجتماع کی بیگانہ صورت سے نتھی ہے نے اندرون ملک نقل مکانی کو اس طرح مہمیز لگائی ہے کہ سندھی اپنے ہی وطن میں تیزی سے اقلیت میں

تبدیل ہونے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کا واسطہ نہ صرف کراچی کی بیگانہ خصوص بورژوا برادریوں اور پنجابی بورژوازی سے ہے بلکہ دیگر قومیتوں و لسانی و قومی گروہوں کی طاقتور اور تیزی سے پھیلتی ہوئی متوسط پرتوں سے بھی ہیں جنہیں ریاست کا خصوص پنجابی مہاجر بالا دستی والا کردار اور زیادہ بڑھاوا دیتا ہے۔ مسٹر بھٹو کی حکومت کے خاتمے نے اس عمل کو اور بھی تیز کیا اور سندھیوں میں سیاسی بیگانگی گہری ہوئی۔ ۱۹۸۳ء کی تحریک میں سندھی عوام کی مجاہدانہ وسیع شرکت اور ریاستی طاقت کی جانب سے اس تحریک کو کچلنے کی بہیمانہ کاروائیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ معاملہ یہیں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ فوجی جنتا نے ایک طرف دیگر قومی و لسانی گروہوں کی وسیع متوسط پرتوں کو جارحانہ بنیادوں پر صف آرا ہونے کی حوصلہ افزائی کی جس کی اپنی معروضی وجوہات ہیں اور دوسری طرف سندھیوں

میں بڑھنے والی سیاسی بیگانگی، خاص طور پر متوسط پرتوں کے کچھ حصوں اور روایتی ڈھانچوں سے متعلق زرعی خواص کے ایک حصے میں سیاسی خلوت اس حد تک بڑھی کہ وہ فوجی آمریت کو سندھو دیش کی دایہ قرار دینے سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ یوں وہ جمہوری دھارے سے کٹ کر پیپلز پارٹی دشمنی میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ فوجی آمریت کے لئے جمہوری قوتوں اور جدوجہد کو تقسیم کرنے اور قومی مسئے کو جمہوری سوال سے متصادم کرنے کی کافی گنجائش پیدا ہو گئی اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فوجی جنتا نے اسے اپنے حق میں استعمال بھی کیا۔

دریں اثنا سندھ میں غیر سندھی قومی و لسانی و نسلیاتی گروہوں میں ایک نئی سطح و نوعیت کی کشمکش اور ابھار نے جنم لیا ہے۔ ایک طرف پنجابیوں اور پختونوں کے خلاف اردو بولنے والے لوگوں نے دیگر اقلیتی گروہوں سے مل کر بالعموم "مہاجر" کے نام پر اپنی علیحدہ سیاسی و سماجی صف بندی کی ہے جس کا اظہار مہاجر قومی موومنٹ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ دوسری طرف "پنجابی پختون اتحاد" و دیگر تنظیموں کے متعصبانہ پلیٹ فارموں سے پنجابی اور پختون متوسط و نچلی پرتوں کے بہت سے حصوں نے صف بندی کی ہے۔

جہاں تک مہاجروں کی شاونسٹ قیادت اور ایم کیو ایم کا تعلق ہے وہ ایک جانب سندھ میں پہلے "نئے سندھیوں" کے نام پر اور اب "مہاجر قومیت" کے نام پر سندھیوں کے مقابلے میں "اربن سندھ" کے دعویدار بن گئے ہیں تو دوسری جانب پنجابیوں کے کراچی میں بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ اور پختونوں کے معیشت اور سماجی زندگی کے بعض شعبوں میں پھیلاؤ کے خلاف متحرک ہو گئی ہے۔ اس سے ماضی کے مقابلے میں دو اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اول: پنجابی، مہاجر، پختون اتحاد ٹوٹ گیا ہے جو پنجابی مہاجر حکمران طبقوں کے درمیان کشمکش کا نیا اظہار ہے۔ دوم: مہاجر مسلم قوم پرستی کے علاقائی تصور یا نظریہ پاکستان کے ناطے اپنی شناخت

و اظہار کی بجائے اب لسانی و ثقافتی اور مخصوص تاریخی حوالوں سے اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ نتیجتاً قدامت پسند جماعتوں کا اثر ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ مہاجر قومی موومنٹ بیک وقت دو طرح کے مفادات کی ترجمان ہے۔ بنیادی طور پر یہ اردو لسانی گروہ کی وسیع متوسط پرتوں کے مفادات کی نمائندہ ہے جنکا تجارت و خدمات کے شعبوں میں حصہ کافی زیادہ ہونے کے باوجود، ان میں تعلیم و دیگر پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے زیادہ فروغ کے باعث زیادہ حصہ درکار ہے۔ تجارت و خدمات کے شعبوں کے تیز پھیلاؤ کے باوجود مہاجروں کی ان کی نئی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے مقابلے میں اتنا حصہ نہیں مل رہا ہے جتنا کہ ان کی ضرورتیں بڑھ رہی ہیں اس پر طرہ یہ کہ پنجابی پختون متوسط پرتیں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہو گئی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ سندھی متوسط پرتیں بھی میدان میں اتر رہی ہیں۔ نتیجتاً نوکریوں، تجارت و خدمات کے شعبے متوسط پرتوں کے مابین میدان کارزار بن گئے ہیں۔ غیر سندھی لوگوں میں یہ محاذ آرائی سندھ میں اپنے اپنے حصے بخرے کے سوال پر ہو رہی ہے جو نہ صرف دست نگر سرمایہ داری کی مخصوص نشو و نما اور تشکیل، پاکستان کے ناطے انتقال آبادی اور اندرون ملک انتقال آبادی کے کراچی کی جانب رخ کا مرہون منت ہے۔

ثانیاً مہاجر قومی موومنٹ کراچی کی مہاجر تجارتی و صنعتی بورژوازی کے مفادات سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ پنجابی بورژوازی کے مقابلے میں وہ مہاجر متوسط پرتوں کے مفادات کے قریب ہے۔ اور بیگانہ تجارتی برادریوں کی بورژوازی کو اردو لسانی گروہ کی صورت میں ایک ایسی وسیع سماجی قوت فراہم ہو گئی ہے جس کے ساتھ جڑ کہ وہ پنجابی بورژوازی کو کراچی کے مرکز سے پیچھے دھکیلنے کی سعی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ امر اب اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مہاجروں کی نچلی متوسط پرتوں کا عمومی مفاد سندھی عوام کے دور رس اور بنیادی مفادات سے متصادم نہیں اور نہ ہی مہاجر متوسط پرتوں کے مختلف حصوں کے مفاد میں ہے۔

دوسری جانب پنجابی پختون اتحاد متضاد قومی و لسانی و نسلیاتی عناصر کا بے جوڑ مجموعہ ہے جس کی قیادت زمین پر قبضہ کرنے والے شہری چوہدریوں اور تجارتی بورژوازی کے بعض عناصر سے متعلق ہے۔ پختون اور پنجابی محنت کشوں اور شہری غریبوں کے مفادات ان سے قطعی مختلف ہیں۔

ان حالات میں جہاں ایک جانب مہاجروں اور پنجابیوں و پختونوں کے درمیان کشمکش نے شدت اختیار کی ہے وہاں اندرون سندھ ایک جانب مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان تضادات شدید ہوئے ہیں تو دوسری جانب سندھیوں اور پنجابیوں و پختونوں میں تضادات نے ایک مختلف شکل اختیار کی ہے۔ لہٰذا سندھی قوم پرست تحریک اور مہاجروں کی تحریک

میں ایک دوسرے کے ناطے متضاد رجحانات نے جنم لیا ہے۔ جہاں کراچی کے مہاجروں کا بنیادی رخ پنجابیوں اور پختونوں کے خلاف ہے وہاں اندرون سندھ مہاجروں کا رخ سندھیوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح سندھی قوم پرست تحریک کا ایک حصہ پنجابیوں کے خلاف مہاجروں سے متحدہ محاذ بنانے اور دوسرا حصہ مہاجروں کے خلاف پنجابیوں سے متحدہ محاذ بنانے کے متضاد اور بدلتے ہوئے رجحانات کا اظہار کرتا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حالانکہ تجارت و خدمات کے شعبوں کا پھیلاؤ دیگر شعبوں کے مقابلے زیادہ تیزی سے ہو رہا ہے اور ان شعبوں کا بڑا حصہ بھی کراچی میں مرکوز ہے۔ اس کے باوجود تیزی سے پھیلتی ہوئی متوسط پرتوں کو کھپانے میں یہ شعبے بھی ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔ نتیجتاً اردو بولنے والے جن میں تعلیم و پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی سطح دیگر قومیتوں کی متوسط پرتوں سے کہیں زیادہ ہے اور زیادہ نسبت سے بڑھ رہی ہے، بھی ان شعبوں میں اپنے زیادہ حصے کے باوجود بتدریج مشکلات کا شکار ہو رہے ہیں۔ اردو لسانی گروہ جیسی ترقی یافتہ متوسط پرتوں کا جب یہ حال ہوگا تو پنجابی پختون متوسط پرتوں کی تیز نشو نما کے نتیجہ میں ان کے مابین کشمکش کا بڑھنا بھی ایک امر ہے اور سندھی متوسط پرتیں ابھی چونکہ تازہ تازہ ابھر رہی ہیں ان کے لئے اپنی ہی منڈی اور دھرتی میں زیادہ طاقتور غیر سندھی متوسط پرتوں نے میدان تنگ کر دیا ہے۔ نتیجتاً سندھی متوسط پرتوں کی نہایت دگرگوں حالت انہیں زیادہ انتہا پسند قوم پرستی کی طرف دھکیلتی ہے۔ نیز ایک سطح پر دیگر قومی گروہوں کے سندھ میں پھیلاؤ کے نتیجہ میں سندھی اور اردو بولنے والے بیک وقت مختلف طور پر دباؤ محسوس کرنے لگے ہیں جو ان کے درمیان جہاں ایک دوسرے سے قریب ہونے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہاں سندھیوں اور مہاجروں کے تضادات کے باعث مضبوط بنیاد کا حاصل نہیں۔ سندھ کی زمینوں پر غیر سندھی خاص طور پر پنجابی آبادکاروں کی آبادکاری سے زمین کے مسئلے نے نازک سوال کی صورت اختیار کی ہے جو ضیاء کے دور میں اور زیادہ بڑھی۔

سرائیکی علاقے میں سرائیکی لوگوں میں قومی احساس بڑھتا ہے جس کا اظہار سرائیکی لسانی تحریک اور سرائیکی صوبہ کے مطالبہ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ سرائیکی لوگوں کا دیگر قومیتوں کی طرح ایک منفرد قومیت کے طور ارتقا جاری ہے۔ سرائیکی قومیت واضح طور پر پنجاب کی بالادستی کا شکار ہے۔ سرائیکی علاقہ کی علاقائی محرومی و نابرابری سرائیکی لوگوں کے لئے ترقی کے غیر مساوی مواقع، سرائیکی متوسط پرتوں کی نہایت دگرگوں حالت اور سرائیکی علاقے میں مقامی دیہی بورژوازی، تجارتی بورژوازی اور چھوٹی قومی بورژوازی کے ابھرنے سے اور لسانی و ثقافتی، نفسیاتی اور تاریخی طور پر منفرد حیثیت نے ایک قومی منڈی اور قومی سیاسی وحدت کے حصول کے عمل کو تیز کر دیا ہے۔ گو ابھی سرائیکی سوال متوسط پرتوں اور زمیندار

بورژوازی کے بعض حصوں تک محدود ہے۔

بلوچستان میں بلوچ متوسط پرتوں اور چھوٹے کاروبار میں بلوچوں کی شرکت میں ماضی کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے۔ خلیج کے ممالک میں کام کرنے والے بلوچوں کی بھیجی ہوئی رقوم نے بھی درمیانی پرتوں میں اضافہ کیا ہے۔ اس عرصہ میں سرد سرز میں بھی بلوچوں کی تعداد و شرکت صوبائی سطح پر بڑھی۔ فوجی آمریت کے حالات نے قومی جبر و دباؤ کو جہاں بڑھاوا دیا وہاں بلوچ متوسط پرتوں میں انقلابی جمہوری رجحانات میں پختگی اور پیٹی بورژوا قوم پرستی میں وسعت پیدا ہوئی۔ بھٹو دور میں مینگل حکومت کے غیر جمہوری خاتمے اور فوج کشی کے نہایت تلخ تجربات اور گہرے زخموں کے زیر اثر بلوچ قوم پرستی کا بڑا حصہ خود کو جمہوری دھارے سے جوڑنے میں ہچکچاتا رہا جبکہ بلوچ قوم پرستی ایسے نعروں اور اہداف پر مرکوز رہی جو موجودہ حالات اور جدوجہد کے مرحلے اور تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لہٰذا بلوچ عوام کا بڑا حصہ جو پہلے ہی قبائلی ڈھانچوں کی خلوت کے باعث سیاسی و سماجی عمل میں پچھڑا ہوا ہے جمہوری عمل اور جدوجہد سے بالعموم علیحدہ رہا۔

دریں اثنا بلوچستان میں پختون متوسط پرتوں کا پھیلاؤ زیادہ تیزی سے ہوا اور تجارتی بورژوازی کی تشکیل زیادہ پختہ بنیادوں پر ہوئی۔ نیز افغان مہاجرین نے بعض علاقوں میں پختونوں کے ارتکاز کو بڑھاوا دیا ہے۔ نتیجتاً بلوچستان میں پختون متوسط پرتوں اور تجارتی بورژوازی کی بلوچوں کے مقابلے میں زیادہ بڑھی ہوئی نشو نما نے ایسے حالات اور رجحانات کو جنم دیا کہ فوجی جنتا اور سامراجیوں نے بلوچوں اور پختونوں کی روایتی دوستی کو دشمنی میں بدلنے کی مذموم کوششیں کیں اور بعض مواقع پر جارحانہ متعصب عناصر اس سازش کا حصہ بن گئے۔

صوبہ پختونخواہ میں بالخصوص اور پختونوں میں بالعموم قومی سوال کے ناطے متضاد کیفیات زیادہ ابھر کر سامنے آئیں۔ بین الاصوبائی تجارت، ٹرانسپورٹ اور خاص طور پر غیر رسمی معیشت کے فروغ جس میں ایک طرف قبائلی علاقوں میں بیرونی اشیاء کی فروخت کے بڑے تجارتی مراکز کی وسعت اور بیرونی کے کاروبار نے تجارتی سرمائے کو زبردست مہمیز لگائی اور دوسری طرف پختون خواہ اور اس سے باہر ملک اور بیرون ملک متوسط پرتوں اور تجارتی بورژوازی کے وسیع فروغ اور تجارت و خدمات و غیر رسمی معیشت میں پختون نو دولتیوں، تجارتی بورژوازی اور متوسط پرتوں کا حصہ پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ تجارتی سرمائے کے بے پناہ فروغ، زرعی سرمایہ داری کی زیادہ شدت والی نشو نما کے بڑھنے سے جہاں روایتی ڈھانچوں اور دقیانوسی رشتوں کا انتشار بڑھ گیا وہاں پختونخواہ

میں نواحی سرمایہ دارانہ منڈی کے تجارتی سرمائے کی سطح پر ٹھہراؤ اور صنعتی نشو نما کی جانب پیش رفت نہ ہو پانے نے ایک جانب پختون خواہ کے اندر قومی مسئلہ کی جانب مختلف طبقوں کے رویوں اور باہم تعلق میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور دوسری جانب پختونخواہ سے باہر بلوچستان اور سندھ میں پختون متوسط پرتوں اور تجارتی بورژوازی کے فروغ سے مختلف نوعیت کے رجحانات میں شدت آئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انقلاب ثور، ۳۰ لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کی پختونخواہ اور بلوچستان میں آمد، سامراجیوں اور علاقائی رجعت پسندوں کی فرنٹ لائن اسٹیٹ کے فرنٹ لائن صوبوں سے افغانستان کے خلاف رد انقلاب کی غیر اعلانیہ جنگ کی طوالت اور سوویت فوجوں کی موجودگی کے پختون قومیت اور اس کے مختلف طبقوں پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان تمام عوامل نے مل کر مختلف طرح کے متضاد رجحانات کو جنم دیا۔

اول: پختون روایتی قوم پرستی جو روایتی ڈھانچوں پختون اور پختون بھائی چارے یا لسلیاتی و تاریخی ماضی کی زوو دار روایات پر انحصار کرتی تھی کی سماجی بنیادیں نہ صرف سکڑ گئی ہیں بلکہ ان ڈھانچوں کے انتشار کے بڑھنے اور سماجی تفریق کے گہرا ہونے سے اس میں ایک عرصہ سے زوال کا رجحان بڑھتا رہا ہے۔ البتہ افغان انقلاب کے پختونخواہ پر پڑنے والے گہرے اثرات نے روایتی قوم پرستی کی شاندار سامراج دشمن روایت کو ایک نئی روح بخشی اور افغان انقلاب کے خلاف رجعتی قوتوں کے زیادہ متحرک ہونے اور انتہائی رجعت پرست فوجی آمریت کی محاذ آرائی نے روایتی قوم پرستی میں ترقی پسند اور جمہوری رجحان کو تقویت بخشی لیکن ترقی پسند جمہوری مافیہ پر روایتی قوم پرستی کی انانیت پھر بھی حاوی رہی جس نے اس کی سماجی بنیاد کی وسعت پر روک لگائے رکھی۔

دوم: پختون خواہ میں تجارتی رشتوں کی تیز نشو نما، شہری زندگی کے فروغ اور صوبے سے باہر بڑھتے ہوئے انخلاء نے پختون لوگوں کی بڑی تعداد کو قوم پرستی سے اور زیادہ بیگانہ کر دیا۔ حالانکہ پختون خواہ میں سرمایہ دارانہ منڈی کے تجارتی سرمائے کی سطح پر رک جانے، صنعتی دور میں داخل ہونے سے پچھڑے رہ جانے اور پنجابیوں کے مقابلے میں کمتر پوزیشن میں ہونے اور دست نگر سرمائے کی مخروط معکوس طرز کی نشو نما کے طفیل پختونوں کے بنیادی سرمائے اور محنت کے نواحی سرمائے کے بڑے مرکز کراچی کی جانب انخلاء سے پختون خواہ میں جدید بورژوا قومی رجحان بھی ابھرے ہیں۔ جو ہنوز ناپختہ ہیں۔ اور روایتی قوم پرستی نیم دلانہ کوششوں کے باوجود اس نئے مرحلے کے بورژوا تقاضوں کو پورا کرنے سے ابھی تک خود کو تیار نہیں پاتی۔

سوم: پختون قوم پرستی پر افغان انقلاب نے متعدد اثرات مرتب کیئے۔ ان میں سامراج دشمنی اور سماجی تبدیلی کی امنگ کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کشاکش میں عظیم

تر افغانستان کے احیاء کی خوش فہمی پر مبنی امیدوں میں اضافہ ہوا یا پھر انقلاب کی در آمد کے واہموں نے جنم لیا۔ جو جنیوا معاہدے کے باوجود ابھی بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

چہارم: سندھ اور خاص طور پر کراچی میں پختون متوسط پرتوں کے فروغ اور تجارت و خدمات کے شعبے میں پختونوں کی بڑھتی ہوئی شرکت کے ناطے جو پختون خواہ سے بنیادی سرمائے اور محنت کے انخلاً اور خود پختون خواہ کی رکی ہوئی سرمایہ دارانہ نشو نما کا نتیجہ ہے۔ پختونوں میں پنجابیوں کے ساتھ متحد ہونے اور متعصبانہ رجحانات کے پختون قوم پرستی پر منفی نوعیت کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

گذشتہ گیارہ سالوں میں جہاں پاکستان میں قومی سوال بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے ذہیں کشمیر، شمالی علاقہ جات اور قبائلی علاقوں کی معیشت کا تعین بھی جمہوری تحریک کو درپیش ہے۔ شمالی علاقہ جات کی آئینی حیثیت کے عدم تعین کی وجہ سے وہاں پر آباد مختلف ذاردیک قومیتیں اور قومی گروہ بدستور اپنے جمہوری و قومی حقوق سے محروم ہیں اور بدترین استحصال کا شکار ہیں۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ وہاں پر بسنے والے عوام کی امنگوں اور مطالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی آئینی حیثیت طے کی جائے اور ان کے جمہوری حقوق بحال کیئے جائیں۔

ایوب دور میں قبائلی علاقوں کی اقتصادی پوزیشن تبدیل ہونی شروع ہوئی۔ قبائلی علاقوں میں چار بڑے مراکز قائم ہوئے۔ (۱) خیبر ایجنسی لنڈی کوتل (۲) کرم ایجنسی پاراچنار اور سدہ (۳) ملاکنڈ ایجنسی اور شمالی وزیرستان جس کے اثرات تمام قبائلی علاقوں پر پڑے۔ خیبر ایجنسی سب سے بڑی تجارتی منڈی کے طور پر ابھری۔

انگریز راج کے زمانے سے جنہوں نے اس علاقے میں سرداری نظام کی بنیاد رکھی تھی ان تجارتی منڈیوں کے قیام تک قبائلی سردار یہاں کی سیاست پر چھائے رہے۔ ایوب خان کے آخری الیکشن سے پیشتر پولٹیکل ایجنٹ ان ملکوں کو پارلیمنٹ میں نامزد کر کے بھیجتے تھے۔ یعنی مخصوص ووٹ کا تکلف بھی گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن ایوب کے آخری دور میں ایک طرف تو تجارتی سرمایہ پیدا ہوا جو بے شک اپنی ابتدائی شکل میں تھا اور اسے قانونی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی تو دوسری طرف قبائلی کوٹے کی بنیاد پر تعلیم یافتہ لوگ خدمات کے شعبے میں بھی گئے اور اس طرح قبائلی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا جس کا اظہار ایوب خان کے خلاف ملک گیر تحریک کے دوران قبائلی علاقوں میں سیاسی تنظیموں یعنی اتحاد قبائل اور دیگر تنظیموں کے ذریعے ہوا۔ ان تنظیموں نے ملک اور پولٹیکل ایجنٹ کے نظام کے خلاف آواز بلند کی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا مطالبہ کیا تاکہ قبائلی سیاست میں اس نئے ابھرتے ہوئے طبقے کا اظہار

ہوسکے۔ لیکن چونکہ تجارتی بورژوازی اور تعلیم یافتہ لوگ ابھی اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ اتحاد قبائل کو ٹوٹ پھوٹ سے بچاسکتے۔ اس تنظیم کا کچھ حصہ انتظامیہ کے ساتھ بھی مل گیا۔
افغان انقلاب اور پاکستان میں الیکشن اور جمہوریت کے قیام سے قبائلی علاقوں میں موجود سیٹ اپ کی تبدیلی کی خواہش میں اضافہ ہوا ہے اور ملک کی سیاست میں عوام کی شرکت کی خواہش اور زور پکڑ گئی ہے۔

ضیاء دور اور پارٹی موقف

ضیاء دور میں پارٹی جن سیاسی رجحانات کے زیر اثر رہی ہے انہیں بحث میں لائے بغیر ہم موجودہ دور میں اپنی سیاسی ترجیحات کا تعین کامیابی سے نہیں کر سکتے۔
ضیاء آمریت کا قیام بھی پارٹی کو اپنی انتہا پسند سیاست سے نکالنے میں ناکام رہا اور پارٹی مہم جوئی کی سیاست پر قائم رہی۔

ضیاء فوجی آمریت نے اقتدار غصب کرتے وقت نوے دن میں انتخابات منعقد کرانے اور اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ پاکستان میں متعدد جمہوریت پسند اور قوم پرست جو پی این اے کے فریب کا شکار تھے۔ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جنرل ضیاء اپنے پیش رو جنرل یحییٰ کی طرح انتخابات کرا کر اقتدار منتقل کردیں گے۔ وہ اس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکے کہ جمہوری اداروں کو پامال کرکے آنے والی فوجی آمریت انتخابات کرانے کے لئے اقتدار نہیں سنبھالتی ہے۔ جنرل ضیا کی سربراہی میں فوجی جنتا نے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ بھٹو حکومت کے مثبت اقدامات اور عوام کی جمہوری لڑائیوں کے حاصلات کی نفی کے لئے کیا تھا۔ تاکہ سامراجی مفادات، نجی سرمایہ دار شعبے اور سول فوجی نوکر شاہی کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔ چنانچہ قومیانے کے عمل کو ختم کرنے اور اس طرح طفیلی سرمایہ کو بحال کرنے کی سرگرم کوششیں کی گئیں۔ لیکن چونکہ نجی سرمایہ ریاستی سرمایہ کے ثمرات سے مستفید ہو رہا تھا۔ مزید برآں نوکر شاہی کو پبلک سیکٹر کی لوٹ مار میں غالب حصے کی توقع تھی۔ اس لئے ڈی نیشلائزیشن کا عمل مکمل نہ کیا جاسکا۔ اگرچہ فوجی جنتا کی حکومت نے نجی سرمایہ کے فروغ کے لئے متعدد مراعات دیں سامراجی سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کے لئے متعدد سہولتیں فراہم کی گئیں، ملک کو درآمدی مصنوعات کی وسیع منڈی میں تبدیل کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی، مزدوروں، طالبعلموں، اور سماج کے دیگر حصوں کی تنظیموں اور سرگرمیوں پر پابندی عائد کی گئیں۔ مزدوروں کو سیاسی عمل میں شرکت سے باز رکھنے

کے لئے ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ملتان کے مزدوروں پر بہیمانہ تشدد کیا گیا۔ جاگیرداروں، خوانین اور سرداروں کے خلاف کسانوں کی بے چینی کو وحشیانہ طریقے سے کچلا گیا۔ ان تمام کوششوں کا مقصد عوام کے حاصلات کی نفی اور رجعتی آمرانہ اقتدار کو مستحکم کرنا تھا۔

رجعتی فوجی جنتا یہ سمجھتی تھی کہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہ پیپلز پارٹی کو سیاسی طور پر ختم کر سکے گی۔ لیکن مذکورہ بالا تمام اقدامات کے باوجود پیپلز پارٹی زیادہ مقبول جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ چنانچہ پی این اے کے تمام شرکا بالخصوص لعب کے قوم پرست رہنماؤں نے "پہلے احتساب اور پھر انتخاب" کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ اور فوجی آمریت نے مثبت نتائج کے یقینی ہونے تک انتخابات ملتوی کر دئے۔ پارٹی کی موضوعیت پسند قیادت نے اس صورت حال میں ملک کے مزدوروں، کسانوں، طالبعلموں، اور دیگر جمہوریت پسند عوام کی تنظیموں کو کال دی کہ آمریت کی جبری حکومت کا تختہ الٹ دو اور اسے محب وطن محنت کش جمہوری طبقوں کی حکومت سے بدل دو۔ مگر بد قسمتی سے عوام کی ان تنظیموں نے پارٹی قیادت کی اس "تاریخی طور پر درست اور صائب رائے" پر کان نہیں دھرا اور نہ پاکستان کا تاریخ جغرافیہ کافی مختلف ہوتا۔ پارٹی نے ۴ نکاتی پروگرام دے کر اپنا فرض انجام دے دیا تھا۔ پارٹی قیادت نے یہ پروگرام مئی ۱۹۷۸ء میں دیا تھا جب ضیاء آمریت اپنے عروج پر تھی۔ اسے محض مہم جوئی بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ایک ایسی پارٹی جو ۴ نکاتی پروگرام دینے اور عوام کو حکومت کا تختہ الٹ دینے کی کال دینے سے چند دن قبل کراچی میں یوم مئی کے مظاہرے میں ۲۲ کامریڈ بمشکل جمع کر سکی ہو جس کا عوام کے کسی حصے میں کوئی اثر و نفوذ نہ ہو جس کے پاس کراچی جیسے سب سے بڑے صنعتی شہر میں ایک ٹریڈ یونین تنظیم بھی نہ ہو جب اس قسم کی کال دیتی ہے تو اسے قیادت کا فکری دیوالیہ پن ہی کہا جاسکتا ہے۔

کراچی کے یوم مئی کے مظاہرے جس میں ایک بڑی اکثریت یعنی (۱۲) گرفتار کر لی گئی کے بعد پارٹی قیادت نے اپنی مہم جویانہ لائن پر تنقید کئے بغیر یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ تن تنہا کوئی بڑی لڑائی نہیں لڑی جائیگی! اس فیصلہ کی روشنی میں صحافیوں کی تحریک میں گرفتاریاں پیش کی گئیں اور ہٹ فیڈر کے کسانوں کی تحریک کی حمایت میں سندھ کے طالبعلموں اور مزدور کامریڈوں کی گرفتاریاں پیش کی گئیں۔ مزید برآں آمریت کے خلاف خفیہ ہنڈ بل وغیرہ شائع کئے گئے جن کی تعداد اشاعت اس قدر کم تھی کہ پارٹی ہمدردوں تک بھی نہ پہنچ پائے، صحافیوں کی حمایت اور ہٹ فیڈر کے کسانوں کی تحریک میں گرفتاریاں پیش کرنا اور چند سو کی تعداد میں خفیہ ہنڈ بل شائع کرنا اسی مہم جویانہ لائن کا تسلسل ہے۔ ان اقدامات سے ضیاء آمریت کو تو عوام میں بے نقاب نہ کیا جاسکا

البتہ یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ ضرور ثابت ہوئے۔ مزید برآں ان مہم جویانہ اقدامات سے فوجی جنتا کے پسر تشدد اقدامات کو مہمیز ملی۔ پارٹی کے متعدد ساتھیوں پر سازش کیس بنائے گئے۔ کئی ساتھی گرفتار کر لئے گئے انہیں تشدد اور اذیت رسانی کا شکار بنایا گیا۔

۱۹۷۸ء میں افغانستان میں ثور انقلاب نے اس خطے کی صورتحال کو اچانک سامراج کے خلاف تبدیل کر دیا۔ افغان انقلاب سے نہ صرف خطے میں قوتوں کا توازن عوام کے حق میں تبدیل ہو گیا، بلکہ افغانستان کے پڑوسی ممالک خاص طور پر پاکستان اور ایران کے عوام میں سماجی تبدیلی اور سامراج دشمن جمہوری امنگوں کو مہمیز ملی۔ جبکہ دوسری طرف ان ممالک کے حکمران طبقوں کو سوشلزم سرحدوں پر دستکیں دیتا محسوس ہونے لگا۔ افغان انقلاب کے بعد فروری ۱۹۷۹ء میں اس خطے میں سامراجی پولیس مین شاہ ایران کا تختہ الٹ دیا گیا جس سے اس خطے میں صورتحال تیزی سے سامراج کے خلاف استوار ہونے لگی۔ ان اہم تبدیلیوں سے جہاں حکمران طبقوں کے اقتدار کمزور ہوئے عوام کے سامراج دشمن جمہوری شعور میں اضافہ ہوا۔ وہاں پاکستان کے حکمران فوجی جنرلوں کو بھی اپنے غاصبانہ اقتدار کے طویل تسلسل کے امکانات نظر آنے لگے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ شاہ ایران کے زوال کے بعد وہی اس خطے میں سامراجی حکمت عملی کے نفاذ کے اہم آلہ کار بن سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ افغان انقلاب کو رد کرنے کی سامراجی سازشوں کو عملی جامہ پہنانے میں بھی سامراجیوں کو ان کی اشد ضرورت ہوگی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایران کا تختہ الٹنے کے دو ماہ سے بھی کم عرصے میں فوجی جنتا نے جناب بھٹو کو پھانسی دے دی۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد فوجی جنتا کو کسی بڑے عوامی رد عمل سے نبٹنا نہیں پڑا۔ پیپلز پارٹی کی جاگیر دار قیادت کو بھٹو کی پھانسی کے بعد اقتدار میں شرکت کے امکانات زیادہ روشن نظر آنے لگے تھے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد کسی بڑے رد عمل کے نہ ہونے سے فوجی جنتا کو یہ حوصلہ ملا کہ وہ عوام کی آواز کو کچلنے کے لئے جبر و تشدد کا زیادہ وسیع استعمال کر سکتی ہے۔ جب کہ پارٹی قیادت اپنی مہم جویانہ لائن کو برقرار رکھے ہوئے تھی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۸۰ء میں پارٹی کے دفتر پر چھاپہ مار کر کامریڈ نذیر عباسی سمیت متعدد کامریڈ کو گرفتار کر لیا گیا۔ کامریڈ نذیر عباسی کو فوجی جنتا نے شدید اذیت رسانی کے ذریعے ۸ اگست کو شہید کر دیا۔ جب کہ دوسرے ساتھیوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ بعد ازاں دارو گیر کا سلسلہ دراز ہوا اور متعدد ساتھی ملک کے مختلف شہروں سے گرفتار کر لئے گئے اور ان پر سنگین نوعیت کے مقدمات قائم کئے گئے۔ جب کہ متعدد ساتھیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ جس کی وجہ سے انہیں ملک کے اندر روپوش رہنا پڑا اور بعض ساتھیوں کو ملک سے باہر جانا پڑا۔

افغان انقلاب اور ایران کے شاہ دشمن انقلاب نے اس خطے کی جغرافیائی سیاسی صورت حال پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ انہوں نے امن کی قوتوں کو حوصلہ بخشا اور اس خطے کے عوام نے محسوس کیا کہ وہ بھی اپنے ملکوں میں سامراجی تسلط اور حکمران طبقوں کے اقتدار کا جوا اتار کر پھینک سکتے ہیں۔ ان کا اپنی قوت پر اعتماد اور بھروسہ بھی دوچند ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکی سامراجی اور اس خطے کے رجعتی حلقوں نے پاکستان کو علاقے کا پولیس مین بنانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ پاکستان امریکی تعلقات میں اتنا سامراجی ارتکاز کبھی نہیں ہوا تھا جتنا افغان انقلاب اور ایران کے شاہ دشمن انقلاب کے بعد ہوا۔ اس سے جنرل ضیاء کی فوجی آمریت کو غیر معمولی سامراجی امداد اور تقویت حاصل ہوئی۔ جب کہ پاکستان کے حکمران طبقوں کے تمام رجعتی حصے بھی اس صورتحال کی وجہ سے بالواسطہ طور پر جنرل ضیا کی فوجی آمریت کو برقرار رکھنے کے خواہاں تھے۔ اس طرح حکمران فوجی آمریت نہ صرف خارجی اعتبار سے بلکہ داخلی اعتبار سے بھی پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس سامراجی ارتکاز اور حکمران فوجی آمریت کی مضبوطی کی وجہ سے اور دوسری طرف عوام کے محنت کش اور جمہوری حصوں میں جمہوری اور سماجی تبدیلی کی امنگوں کے بڑھنے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا کہ پارٹی اپنی تنظیم کاری کے عمل کو تیز کرے اور اپنی قوت کو بڑھائے۔ محنت کش عوام کو ان کے مسائل کی بنیاد پر منظم کرے اور ملک کے سیاسی عمل میں ان کی شرکت کو یقینی بنائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے اتحادیوں اور دیگر جمہوری قوتوں کو ایک وسیع تر محاذ میں پرو کر سامراجی بالادستی اور فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد میں سرگرم عمل ہو۔ کیوں کہ جب تک پاکستان کے محنت کش عوام کی سیاسی عمل میں وسیع شرکت کو یقینی نہیں بنایا جاتا، تب تک محنت کش طبقات کے اتحادیوں اور دیگر جمہوری قوتوں کو بامعنی جمہوری تحریک میں سمویا نہیں جاسکتا۔ محنت کش عوام کی جمہوری سرگرمی ہی جمہوری قوتوں کے دیگر حصوں کو عوام کی قوت پر اعتماد کرتی ہے اور اس طرح جمہوری جدوجہد کی طرف مائل کرتی ہے۔ بصورت دیگر وہ حکمران طبقات کے مختلف حصوں کی طرف جمہوری تبدیلی کی آس میں غلطاں رہتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے پارٹی محنت کش عوام کو منظم کرنے اور اسے سیاسی عمل میں شریک کرنے کی طرف نہ صرف مکمل طور پر ناکام رہی بلکہ اس کیلئے بامعنی اور سنجیدہ کوششوں کا بھی فقدان رہا۔ پارٹی نے تنہا لڑنے کے فیصلے کے باوجود اپنی مہم جو پمفلٹ بازی اور ایسی دیگر سرگرمیوں کو برقرار رکھا۔ پارٹی پر حکمران فوجی آمریت کے حملے سے پارٹی کو شدید نقصان ہوا۔ جولائی ۱۹۸۰ کے حملے سے حکمران فوجی آمریت اپنے سامراجی اور رجعتی مربیوں کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ افغان انقلاب اور اس کے

پاکستانی ساتھیوں کو کچلنے کیلئے پوری طرح تیار ہے۔ یہ صورت حال ۱۹۷۸ کے بعد سے واضح ہو گئی تھی۔ لیکن پارٹی کی مہم جو تنگ نظر قیادت کی انتہائی بے احتیاطی کی وجہ سے حکمران ٹولہ کسی حد تک اپنے مذموم عزائم میں کامیاب رہا۔ پارٹی قیادت کے ایک حصے کو ملک سے باہر کام کرنا پڑا۔ جبکہ کئی ساتھیوں کو قید و بند اور اذیت رسانی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ساتھی جو جیل سے باہر تھے ان کو اس سنگین صورت حال میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے بے انتہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پارٹی کی مرکزی قیادت کا ایک بڑا حصہ اس حملے کے نتیجے میں ملک سے باہر رہا جیل جانے سے پارٹی قیادت کی ذمہ داری ایسے ساتھیوں پر آپڑی تھی جو پارٹی قیادت کو سنبھالنے میں زیادہ تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ ابتری اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ بعض ساتھی جو جیل میں تھے یا ملک سے باہر تھے بدستور خود کو مرکز تصور کرتے رہے جس سے پارٹی میں عملاً تین مرکز قائم ہو گئے۔

پارٹی پر حملہ کے بعد پارٹی کی نئی قیادت نے مہم جو اور تنگ نظر فکر کے خلاف شدید لڑائی لڑی۔ یہ لڑائی پارٹی کے نچلے کیڈر کے اندر دہائیوں سے راسخ رجحانات کے خلاف بھی تھی۔ پارٹی کی مرکزی قیادت کے تینوں مراکز میں پائے جانے والی کجرویوں کے خلاف بھی تھی۔ علاوہ ازیں ملک کی سیاسی صورتحال کے پیش نظر وسیع تر جمہوری اتحاد کی تشکیل کے لیئے بھی کوششیں تیز کر دی گئیں۔ ۲۲ مئی ۱۹۸۲ کو این پی پی اور پی این پی کے انضمام کے بعد پنجاب لوک پارٹی بھی پی این پی میں ضم ہو گئی۔ پارٹی کی طرح بعض دیگر مارکسسٹ گروپ بھی قومی جمہوریت پر یقین رکھتے ہوئے اس کے حصول کے لئے ایک پلیٹ فارم کی پارٹی کے طریق کار پر متفق تھے اور پی این پی کو مشترکہ سیاسی محاذ تصور کرتے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پی این پی کو پارٹی کے کم از کم مکمل پروگرام کی بنیاد پر وسیع تر عوامی تنظیم میں تبدیل کیا جائے۔ سامراج دشمن جمہوری سیاست کو مستحکم اور مربوط کیا جائے اور اس کے گرد جمہوری دھارا تشکیل دیا جائے۔ اس کیلئے پارٹی کی پہل کاری پر اس اشتراک عمل کے دوران ان مارکسسٹ گروپوں کو جو پی این پی میں کام کر رہے تھے پارٹی میں جذب کرنے کی سعی کی گئی۔ اس کے لئے ۱۰ جولائی ۸۲ کو مارکسسٹ رابطہ کمیٹی وجود میں آگئی۔ ایم سی کے ذریعے یہ پیش قدمی کمیونسٹ تحریک میں اتحاد اور یکتا کی تشکیل پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کا بے مثال قدم تھا جس سے پارٹی کی قوت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ تاہم پی این پی ایک نسبتاً وسیع تنظیم بننے کے باوجود ملک کی جمہوری تحریک کو منظم اور فعال کرنے اور ایک وسیع تر جمہوری محاذ کا NUCLEOUS بننے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی دیگر وجوہات جن میں

پی این پی کی قیادت کا غیر فعال رویہ، حکمران طبقوں کے حزب اختلاف کے حصوں سے خیر کی امید، محنت کش اور جمہوری عوام میں حکمران فوجی آمریت کے متبادل کی تشکیل کے نہ ہونے کے ساتھ ساتھ پارٹی کے اندر بعض ساتھیوں میں پی این پی مخالف موضوعیت پسندانہ رجحان بھی رہا ہے۔ جیل کے اندر موجود بعض ساتھیوں نے پی این پی کی قیادت کے کمیونسٹ مخالف رویوں کو بنیاد بنا کر پارٹی کے بعض محاذوں کو نہ صرف پی این پی کے حریف کے طور پر پیش کیا بلکہ پی این پی کے اندر موضوعیت پسندانہ رویوں کے باعث اتحادیوں سے حریفانہ طرز عمل اختیار کیا۔ کسی بھی متحدہ محاذ کے اندر اتحادیوں کے ساتھ اصولوں کے خلاف سمجھوتہ کرنا دم چھلا پن ہے جس کا پارٹی کی قیادت، پارٹی پر پابندی کے بعد سے اب تک شکار رہی ہے۔ لیکن تنظیمی امور کو بنیاد بنا کر متحدہ محاذ میں کشمکش اور تناؤ کو تیز کرنا کسی بھی طرح سائنسی اور معروضی انداز نہیں ہوتا۔ مزید برآں متحدہ محاذ میں کمیونسٹ پارٹی کی قوت کا انحصار پارٹی کی محنت کش طبقوں میں اثر و نفوذ اور ان طبقوں کا سماجی اور سیاسی عمل میں اثر انداز ہونے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ اگر پارٹی اپنے طبقے میں یہ اثر نہیں رکھتی تو سیاسی عمل کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

ایم۔آر۔ڈی کی تحریک کے ابتدائی مراحل میں پارٹی شریک نہ ہو سکی کیوں کہ پارٹی کی قیادت اس تحریک کے مؤثر، قابل عمل ہونے اور اسمیں عوام کی شرکت کے بارے میں واضح نہیں تھی۔ عوام میں پارٹی کے اثر و نفوذ کے نہ ہونے کیوجہ سے پارٹی عوام کی جمہوری بے چینی کی اصل صورتحال سے آگاہ نہیں تھی مزید برآں وہ ایم آر ڈی کے کردار کے بارے میں بھی تذبذب کا شکار رہی۔ چنانچہ تحریک کے آغاز کے بعد پارٹی نے اسمیں شرکت کرنے اور اس کا دھارا وسیع کرنے کی کوشش کی۔ اس سول نافرمانی کی تحریک میں پارٹی کے متعدد ساتھیوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ تاہم اس تحریک کی عملی سرگرمی میں پیپلز پارٹی اور دیگر ترقی پسند جمہوری قوتوں کا حصہ کافی زیادہ تھا۔ دیگر صوبوں کے عوام کی عملاً لاتعلقی کیوجہ سے یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ تاہم اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں سیاسی رجحانات و تضادات زیادہ کھل کر سامنے آئے۔ اس جدوجہد کے دباؤ اور ہمہ گیر نتائج کے پیش نظر حکمران فوجی آمریت کو اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے دیگر راہیں تلاش کرنا پڑیں۔

سوئم۔ انتخابات کے بائیکاٹ کا حربہ: حکمران فوجی جنتا نے ۱۹۸۳ کی تحریک کے نتیجے میں اقتدار میں سویلین شرکت کو بڑھانے کے لئے ۱۹۸۵ میں غیر جماعتی انتخابات کا ڈھونگ رچایا اور قبل ازیں ریفرنڈم بھی کرایا گیا جس میں اسلام کے نام پر جنرل ضیاء

کے عہدہ صدارت کی توثیق کرائی گئی۔ لیکن فوجی آمریت نے سولائزیشن کا منصوبہ بنایا وہ ریفرنڈم میں لوگوں کی مکمل عدم شرکت کے باوجود اسمبلیوں کے انتخابات میں ایم آر ڈی کے بائیکاٹ کے باوجود رائے دھندگان کی اکثریت نے شرکت کی۔ ایم آر ڈی کا بائیکاٹ ناکام رہا۔ اس کی وجہ سے آمریت کو واک اوور مل گیا۔ بائیکاٹ عوام سے کٹ کر کیا گیا۔ جب کہ عوام فوجی آمریت کو ہر شکل میں محدود سے محدود تر کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ بعد ازاں اپریل ۸۶ کے بے نظیر بھٹو کی درمیانی مدت کے انتخابات کے لئے وسیع عوامی مہم بھی ناکامی کی نذر ہو گئی۔

ایم آر ڈی کی تحریک کے تیسرے دور میں عوام کے بڑے حصے فوجی آمریت کی رجعتی اور بنیاد پرست پالیسیوں کے خلاف مزاحمت کرنے لگے۔ خواتین نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ رجعت اور مذہبی جنونیت کے خلاف بھرپور آواز بلند کی اور متعدد ماس ایکشن کئے۔ انہوں نے حدود آرڈی نینس اور شریعت آرڈی نینس کے ذریعہ عورت کو دوسرے درجے کا شہری بنانے کے خلاف مزاحمت کی اور رجعت پسندوں کو بے نقاب کیا۔ اس دور میں مزدوروں، کسانوں، ڈاکٹروں، اساتذہ، طالب علموں، وکلاء اور دیگر حصوں نے اپنے مسائل پر متعدد لڑائیاں لڑیں، ہڑتالیں کیں۔ اگرچہ باہم غیر مربوط لڑائیوں کو تشدد کے ذریعے خاموش کر دیا گیا لیکن ملک کے عمومی سیاسی ماحول پر اور جمہوری تحریک کے فروغ پر ان لڑائیوں کے انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اگرچہ پارٹی ان لڑائیوں میں مؤثر اور عملی شرکت اور انہیں مربوط و منظم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تاہم پارٹی نے اپنی قوت اور وسائل کے پیش نظر ان لڑائیوں میں جہاں تک ممکن ہو سکا حصہ لیا۔ یہ حصہ مزید بہتر ہو سکتا تھا لیکن چونکہ ان لڑائیوں کو منظم و مربوط کرنے کی بجائے پارٹی نے سیاسی محاذ اور متحدہ محاذ کے ذریعے جمہوری تحریک کو فعال بنانے کو اولین ترجیح دینے کی پالیسی اختیار کی جو یقیناً ماضی کی تنگ نظر مجہول اور موضوعیت پسند طرز فکر کا تسلسل تھا۔ پارٹی قیادت نے اسی دور میں ملک کی آزاد ٹریڈ یونینوں اور فیڈریشنوں کو ایک متحدہ تنظیم میں منظم کرنے اور ٹریڈ یونین تحریک کو فعال بنانے کی کوششوں میں سرگرمی سے حصہ لیا اس تنظیم کے قیام کیلئے ابتدائی امور کامیابی سے انجام پا گئے اور یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ یہ تنظیم جلد ہی قائم ہو جائے گی۔ لیکن پارٹی قیادت کے ایک حصہ کی تنگ نظری اور موضوعیت پسندی اس تنظیم کے قیام میں بڑی رکاوٹ بن گئی اور اس تنظیم کا قیام سبوتاژ کر دیا گیا۔ تاہم پارٹی کے مرکزی توسیعی اجلاس کے قیام کے بعد یہ کوششیں از سر نو شروع کی گئیں اور ۱۹۸۸ میں اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

پارٹی نے ملک کی موجود صورتحال میں اپنے فرائض کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ۱۹۸۵ میں سہ رخی پالیسی اختیار کی جس میں پہلے رخ کے طور پر ایم آر ڈی کو مضبوط اور مستحکم کرنا، دوسرے رخ کے طور پر سامراج دشمن جمہوری محاذ کی وسعت اور تیسرے رخ کے طور پر محنت کش طبقات کو منظم اور متحرک کرنا تھا۔ تاہم اس تین رخی پالیسی کے نتیجے میں پارٹی میں موجود تین مراکز ختم نہ ہوسکے اور پارٹی میں تنگ نظر موضوعیت پسند فکر کے خلاف نسبتاً مثبت اور جمہوری رویوں کے مابین کشمکش مزید تیز ہوگئی۔ یہ سہ رخی پالیسی کافی حد تک مبہم تھی اور اس میں واضح طور پر منفی اور غیر سائنسی طرزفکر کو رد نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے ابہام کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی تشریح مرکزی قیادت کا ہر ساتھی مختلف طور پر کر رہا تھا۔ تاہم اس سہ رخی پالیسی کے عمل درآمد میں پارٹی سامراج دشمن جمہوری محاذ اے این پی کو وسعت دینے میں کامیاب ہوئی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۸۶ کو کراچی میں چار ترقی پسند جمہوری پارٹیوں کے ادغام سے ایک نئی سیاسی پارٹی عوامی نیشنل پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔

اس کے ساتھ ہی چاروں پارٹیوں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی، مزدور کسان پارٹی اور پاکستان عوامی تحریک ختم ہوگئیں۔ لیکن پاکستان نیشنل پارٹی کی قیادت جس نے اس وسیع تر تنظیم کے قیام کے لئے پہل کاری کی تھی بعض تکنیکی وجوہ کا سہارا لیکر اس اتحاد سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس تنظیم کے قیام سے ملک کی سامراج دشمن جمہوری قوتوں کے ایک اہم حصے کو متحدہ پلیٹ فارم دستیاب ہوا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس پلیٹ فارم کو مزید وسعت دی جائے تاکہ ملک کی تمام سامراج دشمن جمہوری قوتیں کسی نہ کسی طرح کے متحدہ محاذ میں جمع ہو سکیں لیکن ملک کے سیاسی افق پر ہونے والے ڈرامائی واقعات اور عوامی نیشنل پارٹی کی قیادت کی سرد مہری سے اس سمت مزید پیش رفت نہیں کی جاسکی۔ اس ضمن میں پارٹی بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکی جس کی وجوہات تنظیمی رپورٹ میں درج کی گئی ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی کے قیام سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ یہ ملک کی محروم قومیتوں اور طبقات کی بے چینی کو منظم کرسکے گی لیکن عوامی نیشنل پارٹی کی قیادت نے اپنی قومی تنگ نظری جمہوری سوال کے بارے میں مجرد رویوں اور محکوم طبقات کے بارے میں عدم دلچسپی کے باوصف اس تنظیم کو ایک محدود اور مجہول تنظیم میں بدل دیا۔

پارٹی نے اپنے تنظیمی بحران کی وجہ سے حالیہ انتخابات میں زیادہ سرگرم حصہ نہیں لیا کیونکہ وہ افغانستان کی صورت حال کے تناظر میں انتخابات کے انعقاد کے بارے میں

شش و پنج کا شکار رہی اور پارٹی کی جانب سے کوئی موثر حکمت عملی نہیں اپنائی جا سکی۔ پھر بھی پارٹی ممبران کی ایک قابل ذکر تعداد نے متحدہ پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ لیا۔ اگرچہ ان میں سے کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی لیکن چند ساتھی ووٹوں کے بہت کم فرق سے ہارے۔

جنرل ضیاء الحق کی نیو بوناپارٹسٹ آمرانہ حکومت کا خاتمہ

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جنرل ضیا الحق کی انتہائی رجعتی بوناپارٹسٹ آمرانہ فوجی حکومت ۸ برس تک جمہوری تحریک کے دباؤ اور زمیندار بورژوازی و وسیع متوسط پرتوں کی مزاحمت کے کارن، سویلنیائزیشن کے عمل کو مکمل نہ کر پائی تھی۔ فوجی بالادستی میں سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے عمل نے اقتدار کے ڈھانچے میں نئی پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ جونہی غیر سیاسی انتخابات کے ذریعہ، تحریک بحالی جمہوریت کی جماعتوں کو انتخابی عمل سے باہر رکھ کر پارلیمنٹ اور منتخب ادارے وجود میں آئے اور ضیا کی نیو بوناپارٹسٹ فوجی آمرانہ حکومت نیو بوناپارٹسٹ ریپبلکن حکومت میں تبدیل ہونے کے دور میں داخل ہوئی، اس نے رفتہ رفتہ طاقت کے دو مرکزوں صدر اور وزیر اعظم میں ادارتی کشمکش کو جنم دیا، حالانکہ وزیر اعظم چیف آف آرمی اسٹاف و صدر کا نامزد کردہ تھا، لیکن اپنے خالق کی منشا سے قطع نظر سربراہ حکومت کے ادارے اور پارلیمنٹ نے اپنی ضرورتوں اور لازموں IMPERATIVES کے تحت حکومتی پارٹی اور سرکاری مسلم لیگ کو جنم دیا اور یہ سول سوسائٹی کے ان حکمران طبقوں کے مفادات کی نمائندہ بن گئیں جن کی اقتدار میں شرکت خالص فوجی راج میں بہت معمولی تھی اور جنہوں نے فوجی آمریت سے سمجھوتے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ حالانکہ سول سوسائٹی کی ان آمرانہ استحصالی قوتوں نے جنرل ضیا کے ساتھ اقتدار میں شرکت بوناپارٹ کی شرائط پر کی تھی، لیکن انہوں نے اپنے مفادات کے تئیں رفتہ رفتہ طاقتی ڈھانچے میں زور پکڑنا شروع کیا، اقتدار کے ڈھانچے کے باہر، جمہوری تحریک کے مسلسل دباؤ اور بے نتیجہ جدوجہدوں کا فائدہ بھی نیو بوناپارٹسٹ آمریت کے سویلین بازو کو حاصل ہوا۔ جمہوری تحریک نے اپنی آمریت دشمن جدوجہد کا نشانہ جنرل ضیا الحق پر مرکوز کرتے ہوئے، جونیجو کے سویلین بازو کو اس کے مقابلے میں بڑھاوا دینے کی تدبیر اختیار کی۔ جب بے نظیر بھٹو ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو جلا وطنی کے بعد وطن لوٹیں اور ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور بعد ازاں درمیانی مدت کے انتخابات کے لئے تحریک بحالی جمہوریت نے ۱۴ اگست

۱۹۸۶ء سے اپنی تحریک کا آغاز کیا، تو اس سے پیدا ہونے والے دباؤ اور ناکامی کا فائدہ بھی جونیجو حکومت کو پہنچا۔ جمہوری تحریک کے وسیع دباؤ کا سامنا کرنے کے لئے جنرل ضیا الحق کا انحصار جتنا اپنے تشکیل کردہ سویلین بازو پر بڑھتا گیا اتنا ہی جونیجو حکومت پاور اسٹرکچر میں طاقت پکڑتی چلی گئی۔

یہی وہ مرحلہ ہے، جب گزشتہ دور میں اختیار کی گئی معاشی حکمت عملی کے نتائج منفی طور پر اپنا اظہار کرنے لگے تھے اور معاشی بحران کی شروعات ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ عالمی مالیاتی فنڈ اور ورلڈ بینک کی شرائط قرضہ جات کے تحت جو پالیسیاں اختیار کی گئی تھیں ان کے گہرے مضمرات پوری معاشی زندگی پر پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ ۱۹۸۶ء کی ورلڈ بینک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "پاکستانی معیشت، بعض اہم حوالوں سے وقت کی مہلت پر زندہ ہے۔" اسی طرح یو ایس ایڈ نے ملکی معیشت کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی رپورٹ میں کہا کہ۔ "آئندہ چھ سالوں میں پاکستان سخت معاشی دباؤ سے گزرے گا۔ تاآنکہ اس کی پشت پر موجود سنجیدہ رکاوٹوں کو دور نہیں کیا جاسکتا۔" اسی معاشی بحران کا فوری اظہار مالی بحران اور توازن ادائیگی کی بگڑتی ہوئی صورت حال کی صورت میں ہوا، جس کے حل کے لئے عالمی مالیاتی فنڈ کی شرائط کافی سخت تھیں۔ جونیجو حکومت، فوجی اخراجات کم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ زمیندار زرعی ٹیکس ادا کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور تجارتی و صنعتی بورژوازی نئے ٹیکس قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ نتیجتاً اسی مالی بحران نے حکمران طبقوں میں کشمکش کو تیز کیا۔ جس کا اظہار ۸۸-۸۷ کے بجٹ کی صورت میں ہوا۔ جس کے پیش کرنے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی حکومت کو ٹیکس تجاویز واپس لینا پڑیں اور جو معمولی بچت کے اقدامات بھی کیے گئے، ان پر بھی سول و ملٹری بیوروکریسی سخت نالاں نظر آئی (مثلاً ۱۰۰۰ سی سی سے کم طاقت کی کاروں کے استعمال کی فیصلہ)۔ طاقتی ڈھانچے میں ہونے والی کشمکش کو معاشی بحران کی شروعات نے اور تیز کیا جس کا اظہار ضیا جونیجو کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جنرل ضیا الحق، جنہے بطور نیو بوناپارٹ ۱۹۸۵ء کے آئینی ڈھانچے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، نے جونیجو حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو، وزرائے اعلیٰ کے ساتھ اپنے بڑھتے ہوئے تعلقات اور صوبائی طاقتی ڈھانچے کی جونیجو کی وفاقی حکومت کے مقابلے میں سرپرستی کے ذریعہ جوابی توازن، COUNTER BALANCE پیدا کر کے، کم کرنے کی تدابیر اپنائیں جس نے طاقتی ڈھانچے میں کشمکش کو اور پیچیدہ کر دیا۔

دریں اثناء افغانستان کے خلاف، طویل محاذ آرائی اور غیر اعلانیہ جنگ بھی ایک اہم موڑ پر پہنچ گئی۔ جناب گورباچوف اور صدر ریگن کے درمیان تیسری چوٹی ملاقات کے بعد

عالمی صورت حال میں محاذ آرائی واضح طور پر کم ہو گئی اور فروری ۸۸ء میں سیکریٹری جنرل گورباچوف کی جانب سے سوویت فوجوں کی ۱۵ مئی ۱۹۸۸ء سے واپسی کے اعلان نے، افغانستان کے خلاف صف آرا رجعتی کیمپ میں بھگدڑ پیدا کردی اور جنیوا معاہدے اور افغانستان کے مسئلہ کے سیاسی حل کے لئے، پاکستان کے عسکریت پسند حلقوں اور امریکی سامراج پر دباؤ بڑھ گیا۔ عالمی حالات میں تبدیلی اور افغانستان کے مسئلہ پر سوویت قیادت کی پہل کاری نے پاکستان کے ریاستی اقتدار کے عسکری اور سویلین بازو میں موجود کشمکش کو اور تیز کیا۔ کیونکہ، جونیجو حکومت اور سویلین ڈھانچہ اپنے فوجی سرپرستوں کے مقابلے میں تبھی طاقت پکڑ سکتا تھا اگر جنیوا معاہدے پر دستخط ہوتے اور افغانستان کے خلاف فوجی محاذ آرائی و مداخلت کی بجائے سیاسی حل تلاش کیا جاتا جبکہ فوجی مداخلت اور فوجی حل سے پاکستان کے عسکریت پسند حلقوں اور جنرل ضیا الحق کی آمریت کو تقویت حاصل ہوتی تھی۔ لہٰذا جنیوا معاہدے کے سوال پر جنرل ضیا اور وزیر اعظم جونیجو کے رویہ میں واضح فرق سامنے آیا جسنے طاقتی ڈھانچے میں موجود کشمکش کو، ڈرامائی صورت دے دی۔ جونیجو حکومت نے اس سوال پر کل جماعتی کانفرنس طلب کر کے جنرل ضیا الحق کے مقابلے میں اپنے موقف کی طاقت میں اضافہ کر لیا اور بالآخر امریکی رویہ میں تبدیلی نے جنیوا معاہدے کی راہ ہموار کر کے پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے مقابلے میں جونیجو کی سویلین حکومت کو تقویت بخشی۔ ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو جنیوا معاہدے پر دستخطوں کے باوجود "منفی دو طرفہ پن" POSITIVE SYMMETRY کی آڑ میں عسکریت پسند اور بنیاد پرست حلقوں نے افغانستان میں فوجی مداخلت اور فوجی محاذ آرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ جونیجو حکومت کو جو اس کشمکش میں کمزور پوزیشن میں تھی ایک بہتر موقع اوجھڑی کیمپ کی تباہی سے حاصل ہو گیا۔ اوجھڑی کیمپ کی تباہی نے ایک طرف پاکستان کی عسکریت پسند حلقوں خاص طور پر ضیا الحق کی زیر قیادت انٹر سروسز انٹیلی جینس ISI کی مہم جویانہ سرگرمیوں اور اعلیٰ پیمانے کی کرپشن و غیر ذمہ داری کو طشت از بام کر دیا تو دوسری طرف اس تباہی کے خلاف عوام الناس کا غیض و غضب بہت زیادہ بڑھ گیا۔ جس نے جونیجو حکومت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ طاقتی ڈھانچے میں کشمکش میں، اس واقع سے اپنے حق میں پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں طاقتی ڈھانچے کے سویلین بازو اور جنرل ضیا الحق کے فوجی ٹولے کے مابین کشمکش فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی، یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ جونیجو کو اوجھڑی کیمپ کی تباہی کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے فوجی جرنیلوں کے دوسرے گروہ کی حمایت حاصل تھی جو جنرل ضیا اور آئی ایس آئی کے نیٹ ورک سے باہر تھا۔ اس

سے قبل کے جونیجو حکومت کوئی اقدام کرتی جنرل ضیاالحق نے عجلت میں زیادہ ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی سویلین ڈھانچے کو یکسر برطرف کر دیا جس کی تشکیل اس نے بڑی مشکل سے کی تھی۔ ۲۹ مئی کو وزیراعظم جونیجو سمیت تمام اسمبلیوں کو برطرف کر دیا گیا اور جنرل ضیاالحق کی حکومت پھر سے نیو بوناپارٹسٹ آمرانہ حکومت کے آٹھ سالہ دور کی جانب مراجعت کر گئی۔

جنرل ضیاالحق نے جونیجو حکومت اور اسمبلیوں کی برطرفی کا اعلان اسی جواز سے کیا کہ یہ ادارے اور اس کے اراکین بدترین کرپشن کا شکار تھے، حالانکہ یہی لوگ صالحین قرار دیئے گئے تھے اور چند ہی روز میں عبوری حکومت کی بغیر وزیراعظم کے تشکیل اور اس میں پرانے کھلاڑیوں کی شرکت نے اس کاروائی کے "اخلاقی جواز" پر پانی پھیر دیا۔ جنرل ضیا نے اپنی سراسیمگی کو چھپانے کے لئے ایک بار پھر اسلامائزیشن کا سہارا لیا اور شریعت آرڈیننس جاری کیا اور ماضی کی طرح ایک بار پھر ۹۰ روز کے اندر انتخابات کا اعلان کیا، جو ظاہر ہے انتخابات کے بڑھتے ہوئے مطالبے کے اثر کو کم کرنے کے لئے کیا گیا تھا، کیونکہ اس کے ساتھ ہی اسلام و شریعت کے حوالے سے اسلامی طرز حکومت کی متنازعہ بحث چھیڑ دی گئی تھی۔ برطرفی کے بعد جونیجو اور اس کے حامیوں جو حکمران طبقوں کے مصالحت پسند حصوں خاص طور پر قدامت پسند زمینداروں کے نمائندے تھے میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ ضیا کے اس غیر جمہوری و غیر آئینی اقدام کو چیلنج کرتے اور ابھی عدلیہ میں بھی ضیا کی موجودگی میں اتنا دم خم نہ تھا کہ وہ غیر آئینی اقدام کو معطل کرتی۔ لیکن جنرل ضیا کے اس اقدام نے فوجی آمریت کو جاری رکھنے میں مشکلات کو دو چند کر دیا۔ حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ یا تو ملک بھر میں وسیع جمہوری تحریک سے ضیاالحق پر انتخابات کے لئے دباؤ ڈالا جاتا یا پھر ضیاالحق کی آمرانہ حکومت عوامی دباؤ سے بچنے کے لئے کوئی نیا راستہ اختیار کرتی۔ بہر کیف، جنرل ضیاالحق کی نیو بوناپارٹ آمرانہ حکومت اپنے دور کے بدترین بحران کی لپیٹ میں تھی اور بدستور اندرونی و بیرونی طور پر مہم جوئی کی راہ پر گامزن تھی اس کی آمریت کے اتحادیوں کا بڑا حصہ اسمبلیوں کی برطرفی کے بعد اس سے دور ہو گیا تھا۔ سویلین ڈھانچہ ختم ہو گیا تھا اور نئے امدادی سویلین ڈھانچے کی تشکیل پہلے سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ نئے بدلتے ہوئے عالمی اور اندرونی حالات میں ضیا کی فوجی آمریت دست نگر استحصالی ڈھانچے اور حکمران طبقوں کے مفاد میں کار آمد نہ رہی تھی اور عالمی سامراج کے لئے بھی خطے کے بدلے ہوئے حالات میں اس کی حیثیت چلے ہوئے کارتوس کی ہو چلی تھی۔ اس سے پہلے کے اندرونی بیرونی حالات کے تال میل سے کوئی نئی کشمکش یا نیا ابھار سر اٹھاتا، ۱۷ اگست ۸۸ء کے فضائی

حادثہ میں جنرل ضیا الحق اپنے اہم رفقا سمیت صفحہ ہستی سے نابود ہو گیا۔ ملک کے سنگین اندرونی بیرونی حالات میں فضائی حادثہ نے وہی کردار ادا کیا ہے جس طرح نازک مواقع پر کوئی حالات پوری صورت حال کو تبدیل کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ حکومت، جس فوجی جنتا کے سہارے برسر اقتدار آئی تھی، وہ کبھی کی ریٹائر ہو چکی تھی اور آخری دور میں جنرل ضیاء نے آئی ایس آئی کے بل پر خود کو فوج سے ماورا کر لیا تھا۔ حالانکہ فوجی جرنیلوں کو اس نے کئی سطحوں پر شامل اقتدار بھی کیا ہوا تھا۔ ۲۹/مئی ۱۹۸۸ء کی کاروائی سے اس نے اپنی سویلین بازو پہلے ہی توڑ لیا تھا اور اچانک فضائی حادثہ نے نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ طاقتی ڈھانچے میں ایک زبردست خلاء پیدا کر دیا۔ وہ اپنی مرکزی کڑی سے محروم ہو گیا۔ ہر دو اعتبار سے (سویلین و ملٹری) جنرل ضیا کی نیو بونا پارٹسٹ حکومت خود بربادی کی نذر ہو گئی تھی لیکن ابھی بھی آمرانہ ڈھانچہ موجود تھا جو اپنے سر سے محروم ہو چکا تھا۔ ایسے میں فوجی جنتا کی عدم موجودگی میں اندرونی و بیرونی عوامل اور طاقتی ڈھانچے کی پیچیدگیوں اور پیدا شدہ خلا نے کسی نئے جنرل کے برسر اقتدار آنے کو مشکل بنا دیا تھا اور جو متحرک عوامل در پردہ کارفرما تھے وہ بھی نئی فوجی آمریت کے لئے بظاہر ممد نہ تھے۔ دوسری طرف جنرل ضیاء کی موت سے ریاستی اداروں میں موجود بے ضابطگی ختم ہو گئی اور ۱۹۸۵ء کے آئین کے تحت سینٹ کے چیئرمین کی جانب سے عہدہ صدارت سنبھالنے سے صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف کے ادارے بھی علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ یہ وہ اہم نکتہ تھا جس کے لئے جمہوری قوتیں اور خود جونیجو حکومت بھی دبے دبے طور پر سرگرداں رہی تھی۔ جہاں نئے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ، نے فوج کی سیاست سے علیحدگی کا اعلان کیا اور یہ فوج کے سیاست میں طویل عرصہ تک ملوث رہنے کے خلاف پیدا ہونے والی پیشہ ورانہ رائے کے مطابق تھا، وہاں پیدا ہونے والے خلاء کو "ایمرجینسی کونسل" کے ذریعہ پر کر کے فوج کا سیاست میں عمل دخل برقرار رکھا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وزرائے اعلیٰ کی مسلم لیگ اور عبوری حکومت بھی اس عبوری حکومتی انتظام میں شامل رہی۔ مجموعی طور پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جنرل ضیاء (بونا پارٹ) کے بغیر آمرانہ ڈھانچہ بدستور موجود تھا اور جنرل ضیاء کی پالیسیوں کے تسلسل پر مصر تھا، لیکن پیدا شدہ خلاء اتنا سنگین تھا کہ یا تو اسے کوئی بونا پارٹ پر کرتا یا پھر انتخابات کے ذریعہ اسے سویلین قوتوں سے پر کیا جاتا۔ جنرل ضیاء کے منظر سے ہٹنے سے جمہوری قوتوں، خاص طور پر پاپولسٹ پیپلز پارٹی اور ریاستی ڈھانچے کے مابین واحد بعد دور ہو گیا اور جنرل ضیا کی موت سے وہ خون کی لکیر بھی مٹ گئی جو بھٹو کو تختہ دار پر چڑھانے سے کھنچ گئی تھی۔

اس پر طرہ یہ کہ پاپولزم نے بے نظیر بھٹو کی امریکہ یاترا کے بعد سے ایک جانب اصلاح پسندی اور دوسری جانب سامراج سے پیدا شدہ وقتی دوری کو ترک کر دیا تھا اور بے نظیر بھٹو ۱۰/اپریل ۱۹۸۶ء کو وطن واپسی کے بعد سے موجودہ سسٹم کے اندر رہتے ہوئے، اسی کے رولز کے مطابق سیاست کرنے پر راضی ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود عبوری حکومت میں شامل قوتیں وہی تھیں جو ضیاء کی پیدا کردہ تھیں یا پھر اسی پالیسی کے تسلسل پر عمل پیرا ہونے پر مجبور تھیں۔ لہٰذا صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف کی جانب سے غیر جانبداری کے دعوے کے باوجود، عبوری حکومتوں کی سرپرستی ہی میں انتخابات کا انعقاد اس امید پر کیا گیا کہ یا تو آمرانہ قوتیں انتخابات میں آگے آجائیں گے یا پھر پیپلز پارٹی معمولی اکثریت سے، کمزور حیثیت میں آئے گی بھی تو سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں سول سوسائٹی کی دو بڑے کیمپوں میں تقسیم اور حکمران طبقوں میں کشمکش کے ہوتے ہوئے سول و ملٹری بیوروکریسی کو ضیاء کے ہٹتے ہی پھر سے "قابل قبول" ثالث کی حیثیت حاصل ہو گئی اور دونوں اطراف سے اس کی حیثیت کو کوئی بنیادی چیلنج درپیش نہ تھا۔ اس کے باوجود عبوری انتظامیہ کی پشت پر سول و ملٹری بیوروکریسی کا طاقتور گروہ، خاص طور پر آئی ایس آئی، وسیع تر آمریت نواز بنیاد پرست، اور انتہائی رجعت پسند قوتوں کو ایک محاذ میں متحد کرنے اور جمہوری قوتوں کے خلاف انہیں زور شور سے متحرک کرنے میں جت گیا۔ باوجودیکہ، انتخابات کے بارے میں واضح اعلانات اور پروگرام دیا جاچکا تھا، ملکی فضاء شکوک اور بے یقینی لئے ہوئے تھی۔ یہی وہ محدود عبوری عرصہ ہے جب ریاستی اقتدار کی عبوری اور نامکمل حالت میں بہت سے دیگر عناصر عدلیہ نے بھی اپنی اضافی خود مختاری کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں سیاسی جماعتوں کی شرکت سے انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنایا اور جنرل ضیاء الحق کے اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو بے جواز قرار دے کر اس طرح کالعدم کیا کہ جونیجو حکومت کو بحال کیئے بغیر انتخابات کی راہ ہموار کی۔

عبوری انتظامیہ کے تین مرکزوں کے مابین توازن اس نوعیت کا تھا کہ آزادانہ انتخابات کے لئے رائے عامہ اور بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ کو نظرانداز کر کے انتخابات سے راہ فرار مشکل تھی۔ بعض آمریت نواز حلقوں کی مارشل لاء کو دوبارہ مسلط کرنے کی کوششوں کے باوجود، انتخابات کے التواء کا مطلب ملک کو ایک نئے سنگین بحران سے دوچار کرنا ہوتا اور یہ پاکستان کے گماشتہ حکمرانوں کے آقا امریکی سامراج کو بھی قبول نہ تھا۔ ان تمام عوامل کے تال میل نے مل جل کر انتخابات کے طویل عرصہ بعد انعقاد کو ممکن بنایا۔

یہاں ہم یہ عمومی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں پاکستان میں سماجی ڈھانچوں کا بحران اور حکمران طبقوں کی کشمکش جہاں نیو بونا پارٹسٹ آمرانہ حکومتوں کو جنم دیتا ہے، وہاں فوجی حکومتوں کے لئے بھی یہ زیادہ لمبے عرصہ تک تن تنہا حکومت کرنا ممکن نہیں ہے اور انہیں جلد یا بدیر خود کو ریپبلکن حکومتوں میں بدلنا ہوتا ہے، یوں وہ اپنے پراسس کو جنم دینے پر مجبور ہوتی ہیں جو خود نیو بونا پارٹسٹ فوجی حکومتوں کے زوال کی حالت پیدا کرتی ہیں۔ نیز سوسائٹی میں متوسط پرتوں کے فروغ، زمیندار، بورژوازی کی پختگی اور اور سرمایہ دارانہ نشو نما کے تقاضے، سوسائٹی کی ریاستی اقتدار میں شرکت اور کسی طرح کے ایسے جمہوری ڈھانچے، جس میں ان قوتوں اور مفادات کی شمولیت کو یقینی بنایا جا سکے، کی تشکیل معروضی ضرورت بن جاتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کس طرز کا حکومتی ڈھانچہ، حکمران طبقوں کے کثرت مفادات کو ممکنہ حد تک پورا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سوال حکمران طبقوں کے مابین کشمکش، جمہوری، قومی اور طبقاتی قوتوں کے دباؤ اور دست نگر جدید نو آبادیاتی ڈھانچے کے عمومی مفادات اور لازموں سے مل جل کر طے ہوتا ہے۔ پاکستان میں حالات کی نئی کروٹ، خاص طور پر آمرانہ ڈھانچے میں پیدا ہونے والے خلاء اور سیاسی تقسیم کے قطبوں کی نوعیت اتنی موافق تھی کہ انتخابات کا انعقاد ہی دست نگر ڈھانچے اور استحصالی مفادات کے لئے بہترین راستہ تھا۔

انتخابات اور ناتواں جمہوری ڈھانچہ

۱۶ نومبر کو قومی اسمبلی اور ۱۹ نومبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا، طویل آمریت کے سیاہ دور کے خاتمے پر، انعقاد آمرانہ قوتوں کی جمہوری قوتوں کے ہاتھوں شکست کے نتیجے میں نہیں بلکہ طاقتی ڈھانچے میں ہونے والی ڈرامائی تبدیلیوں کا مرہون منت تھا۔ انتخابی شیڈول اتنے کم وقت پر مشتمل تھا اور سیاسی تبدیلیاں تیزی سے وقوع پذیر ہو رہی تھیں کہ اچھے خاصے سیاسی عناصر ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک طرف انتظامیہ اور عبوری حکومتوں کی سربراہی اور آئی ایس آئی کی پشت پناہی سے ملک بھر کی آمریت نواز، انتہائی رجعت پرست اور بنیاد پرست قوتوں کو اسلامی جمہوری اتحاد IJI کی صورت میں متحد کر دیا گیا، مسلم لیگ کی تقسیم کے بعد کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسٹر جونیجو پاکستان عوامی اتحاد جس کے وہ سربراہ چنے گئے تھے کو چھوڑ کر دوبارہ مسلم لیگ کو متحد کر لیں گے اور اسلامی جمہوری اتحاد، جس کی ضیا نواز پالیسی سے وہ سرعام اختلاف کر چکے تھے، میں شامل ہو جائیں گے۔ اسلامی جمہوری اتحاد بیک وقت پنجابی بورژوازی کے گماشتہ، نودولتی اور رجعتی حصوں، قدامت پسند زمینداروں خواص اور پیٹی بورژوازی، متوسط پرتوں کے انتہائی رجعتی حصوں کے مفادات کے نمائندے

طور پر سامنے آئے۔ اس کا بنیادی زور ضیاء دور کے تسلسل، افغانستان میں جہاد، کے ذریعہ بنیاد پرستوں کی حکومت کے قیام، اینٹی انڈیا شاونزم، جنونی عسکریت پسندی اور خاص طور پر ایٹم بم کا حصول، پاکستان کو ملاؤں کی ریاست بنانے کا عزم اور مسٹر بھٹو کی اصلاح پسندی کے ناطے ملکیت دار طبقوں میں خوف پیدا کر کے ان کی حمایت جیتنے پر تھا۔ اس نے پیپلز پارٹی کے نچلے طبقوں میں حمایت کمزور کرنے کے لئے بھی نعرے بازی سے کام لیا۔ لیکن اس کی مہم منظم اور انتخابی نکتہ نظر سے زیادہ منصوبہ بند تھی۔ انتظامیہ کی اشیر باد سے اس نے برادریوں، مختلف حلقہ ہائے انتخابات کے مضبوط مقامی گروہوں، سرکاری ذرائع ابلاغ اور ریاستی مشینری کو پورے طور پر اپنے حق میں استعمال کیا اور پرتوں کے متفرق اور متحارب عناصر کو پی پی پی دشمن محاذ میں متحد کرنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی نے تحریک بحالی جمہوریت میں شامل جماعتوں کے اتحادیوں جو پی پی پی سے زیادہ رعایات کا تقاضہ کر رہے تھے، کو چھوڑ کر تن تنہا میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اس ملک کی تاریخ کا طویل ترین، جمہوری محاذ ایم آر ڈی اپنے انجام کو پہنچا۔ پی پی پی جو بورژوا زمیندار طبقوں، اعلیٰ و درمیانی پرتوں کے مفادات کی آزاد خیال اور بورژوا جمہوری نمائندہ تھی نے بھٹو کی پھانسی کے بعد سے پاپولزم میں پائی جانے والی سامراج دشمن اور ریڈیکل جمہوری رجحانات کو کبھی کا تج دیا تھا اب مسٹر بھٹو کے ابتدائی دور والی اصلاح پسندی سے بھی تائب ہو چکی تھی۔ اس کے انتخابی پلیٹ فارم کا بنیادی زور مسٹر بھٹو کی شہادت، ۷۰-۱۹۶۸ء والی انقلابی نعرے بازی، آمریت کے خلاف جدوجہد اور قربانیوں کے قصوں، عوام کی حالت سدھارنے اور خارجہ پالیسی میں امریکی مفادات کے تابع میانہ روی اختیار کرنے اور اینٹی انڈیا شاونزم اور عسکریت پسندی خاص طور پر ایٹم بم بنانے جیسی نعرہ بازی سے شروع کیا اور ۱۹۷۳ء کے آئین والی جمہوریہ کی بحالی پر زور دیا۔ ملک بھر میں انتخابی مہم میں یہ دو بڑے پلیٹ فارم سامنے آئے، جن کی انتخابی مہم پر شخصی و ذاتی اور فروعی رنگ حاوی رہا، اگر ماضی کی پہچان اور کردار لوگوں کے سامنے نہ ہوتا اور پچھلے دور کی سیاسی صف بندی حاوی نہ ہوتی، جو کہ ظاہر ہے انتخابات پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتی، تو انتخابات کا رنگ بہت پھیکا ہو جاتا اور یہ سیاسی و جماعتی انتخابات ہوتے ہوئے بھی غیر سیاسی صورت اختیار کر جاتے۔

انتخابات میں ان دو بڑے مرکزوں یا پلیٹ فارموں کے وجود میں آنے سے، انتخابی مہم میں، کسی تیسری قوت کا ابھرنا، ملک کے مخصوص ماضی کے ناطے کافی مشکل تھا۔ پاکستان عوامی اتحاد انتخابی مہم میں اترنے سے پہلے ہی اپنا سربراہ اور ساکھ گنوا بیٹھا،

جبکہ مظلوم قومیتوں کی مختلف النوع قوم پرست قوتیں بھی کوئی مشترک پلیٹ فارم تشکیل نہ دے پائیں، آمریت کے سخت حالات میں قومی مسئلے کے ناطے جو پروگرام سامنے آئے بھی تھے۔ (مثلاً اے این پی کا نئی آئین ساز اسمبلی کا نعرہ) وہ دو بڑے پلیٹ فارموں اور جمہوری لہر کے سامنے کوئی اثر نہ دکھا سکے۔ ماسوا جمعیت العمائے اسلام (فضل الرحمان گروپ) کے ایم آر ڈی کو کوئی جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ البتہ اے این پی نے نام کی حد تک اپنا وجود برقرار رکھا اور لسانی بنیادوں پر ایم کیو ایم نے سندھ کے شہری علاقوں کے مہاجروں کو اپنے ساتھ بہالیا۔

باوجودیکہ انتخابات کا انعقاد ایک طویل عرصہ کے بعد ہوا تھا، انتخابی مہم میں ملک کو درپیش اندرونی و بیرونی سوالات و مسائل پر ہر دو پلیٹ فارموں کی جانب سے کوئی ٹھوس پروگرام سامنے نہ آیا بلکہ بنیادی مسئلوں پر دونوں کے موقف میں سیاسی و نظریاتی ثقافتی فرق کے باوجود اپنے مافیہ میں کوئی بنیادی تضاد نہ تھا۔ البتہ ہر دو محاذوں کی ماس اپیل ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف تھی۔ ضیاء کے طویل دور میں سیاسی کلچر اور سیاست کی قیمت میں جو تبدیلیاں آتی تھیں ان کا عمل دخل انتخابات میں اچھا خاصا رہا، خاص طور پر مقامی و بلدیاتی سیاست کے گرد تشکیل پانے والے مفادات اور گروہ، سیاست میں بڑے پیمانے پر پیسے کا عمل دخل اور برادریوں قبیلوں، فرقوں اور دیگر گروہی و لسانی عوامل نے انتخابات کے نتائج کو متاثر کیا۔ انتخابی عمل میں عوام کی شرکت میں وہ جوش و خروش نظر نہیں آیا جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا طرہ امتیاز تھا۔ اس بار ۱۶/ نومبر کے انتخابات میں صرف ۶ء۴۳ فی صد ووٹ ڈالے گئے، حالانکہ ۱۹۷۰ میں یہ شرح ۶۳ فیصد تھی اور یہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی ۵۵ فیصد شرح سے بھی بہت کم تھی۔ اس میں یقیناً ووٹ کے لئے شناختی کارڈ کی بندش نے اہم کردار ادا کیا۔ لیکن کم مدتی انتخابی مہم میں عوام کو متحرک کرنے والے پروگرام کی عدم موجودگی نے بھی عوام کی دلچسپی کو کم کیا۔

قومی اسمبلی کے لئے انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ پی پی پی نے جہاں سندھ کے دیہی علاقوں میں مکمل فتح حاصل کی وہاں، پنجاب کے ترقی یافتہ اضلاع (لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، فیصل آباد اور ملتان) میں بھاری اکثریت حاصل کرنے کے علاوہ پختون خواہ میں خالص طور پر پشاور میں مؤثر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پیپلز پارٹی نے مجموعی طور پر ۳۸ء۵۸ فیصد ووٹ حاصل کرکے ۶۳ء۳۵ فیصد نشستیں (۹۳) حاصل کیں اور یوں اس نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرکے آئی جے آئی پر اپنی برتری ثابت کر دی۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھی پی پی پی نے اتنے ہی فیصد

ووٹ (۳۹ فیصد) حاصل کر کے ۵۸٫۷ فیصد نشستیں حاصل کی تھیں، کیونکہ اس کے مخالفین خاص طور پر مسلم لیگ اور مذہبی جماعتوں کے ووٹ تقسیم ہو گئے تھے۔ اس بار پی پی پی نے صوبہ پختون خواہ میں ماضی کے مقابلے میں کہیں بہتر پوزیشن حاصل کی اور بلوچستان میں بھی اس کا ایک رکن منتخب ہو گیا۔ سندھ میں پی پی پی کی فقید المثال کامیابی، جہاں سندھیوں کی جمہوری تحریک میں دیگر قومیتوں کے مقابلے میں زیادہ موثر شرکت کی مرہون منت ہے وہاں قومی محرومی نے جمہوری لہر کا حصہ بن کر ان تمام عناصر جو کسی نہ کسی طور پر آمرانہ قوتوں کے ساتھ نتھی رہے تھے کا صفایا کر دیا اور اس لہر میں وہ بھی نے بچ پائے جن کا ریکارڈ قدرے بہتر تھا۔

پنجاب میں گو پی پی پی نے اکثریتی نشستیں تو حاصل نہ کی، البتہ یہ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اس نے یہاں ۴۰ فیصد ووٹ حاصل کر کے ۵۲ نشستیں حاصل کیں۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی اپیل مظلوم طبقات اور ملک گیر جمہوری پارٹی کے طور پر متوسط پرتوں کے جمہوری عناصر تک محدود رہی اور بعض حلقوں میں مقامی طور پر مضبوط زمیندار گروہوں نے بھی اس کی کامیابی میں کچھ کردار ادا کیا جبکہ بعض جگہوں پر ضیا کے کاسہ لیسوں کو ٹکٹ دے کر اس نے نقصان بھی اٹھایا۔ صوبہ پختون خواہ میں جنوبی اضلاع اور ہزارہ کو چھوڑ کر جہاں روائتی اور قدامتی ڈھانچوں سے منسلک خواص ہی انتخابات کو معین کرتے ہیں۔ پی پی پی نے سیاسی روایات کے حامل ترقی یافتہ اضلاع میں مسلم لگ اور اے این پی پر برتری حاصل کر لی۔

دوسری طرف اسلامی جمہوری اتحاد نے ۲۹٫۸۱ فیصد ووٹ حاصل کر کے ۲۶٫۸۳ فیصد نشستیں حاصل کیں اور یہ دوسرے نمبر کی جماعت بن کر ابھری۔ حالانکہ اس بار ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں دائیں بازو کی رجعت پسند، آمریت نواز اور بنیاد پرست قوتیں زیادہ متحد تھیں وہ زیادہ موثر کارکردگی کا مظاہر نہ کر پائیں، ۱۹۷۰ء میں مسلم لیگ اور مذہبی جماعتوں نے ۴۴ فیصد ووٹ حاصل کر کے فقط ۱۲ فیصد نشستیں حاصل کیں تھیں۔ اس کے مقابلے میں اس بار انہیں جہاں ووٹ کم پڑے وہاں نشستوں کا تناسب ووٹوں کے تناسب سے کم نہ رہا۔ سندھ میں آئی جے آئی کا مکمل صفایا ہو گیا۔ جبکہ پنجاب میں خاص طور پر پوٹھوہار، سیالکوٹ اور پسماندہ اضلاع میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے ۴۵ نشستیں حاصل کیں۔ پختون خواہ میں اس کی کامیابی ہزارہ ڈویژن اور جنوبی اضلاع کے پسماندہ علاقوں کے روائتی خواص کے مرہون منت رہی۔ تیسری طرف سندھ کے شہری علاقوں میں مذہبی جماعتوں کی جگہ مہاجر ووٹروں میں ایم کیو ایم نے کامیابی حاصل کی جو مہاجر متوسط پرتوں کی دیگر متوسط پرتوں کے مقابلے میں نت بڑھتی ہوئی

مانگوں اور میونسپل مفادات کے علاوہ کراچی کی بیگانہ بورژوازی کے مفادات کی مظہر ہے۔ جبکہ بلوچستان میں جمعیت العلمائے اسلام کی پختون علاقوں میں کامیابی جہاں منتشر ہوتے ہوئے قبائلی سماج میں بڑھتے ہوئے مذہبی اثر و رسوخ کی مظہر ہے وہاں یہ قوم پرست قوتوں کی روایتی قوم پرستی کے زوال اور ان قوتوں کے باہم انتشار جو اس زوال ہی کی دین ہے کی ناکامی کو ظاہر کرتی ہے۔ بلوچ علاقوں میں جہاں پی این پی ۵۴ء۱۱ ووٹ حاصل کرنے کے باجود بھی کوئی نشست حاصل نہیں کر سکی کیونکہ نہ تو اس کی قبائلی بنیاد اتنی مضبوط تھی اور نہ ہی یہ نچلی سطح پر عوام سے جڑی ہوئی تھی۔ وہاں بلوچ قوم پرست قیادت کا عدم موجودگی اور جمہوری تحریک سے قومی جدوجہد کے جدا رہنے کے باعث قوم پرست قوتیں مؤثر قوت کے طور پر نہ ابھر سکیں، حالانکہ بی این اے کی صورت میں ایک طرف قبائلی اثرو رسوخ اور دوسری طرف بی این وائی ایم کے تربت کے علاقہ میں اثر ورسوخ کے ناطے یہ دو نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہاں بھی پختون علاقوں کی طرح بلوچ قوم پرستوں کے باہم انتشار کے نتیجے میں جمعیت العلمائے اسلام ایک نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجموعی طور پر بلوچستان کے نتائج قدامت پسند اور منتشر نوعیت کے ہیں، جن پر بالعموم ابھی بھی قبائلی عناصر نے فیصلہ کن اثرات مرتب کئے اس کی واحد وجہ، انتہا پسند قومی مفروضوں پر جمہوری تحریک سے کمزور ناطے میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ صوبہ پختون خواہ کے نتائج بھی ماضی کی طرح منقسم رہے، ہزارہ ڈویژن اور جنوبی اضلاع میں ماضی کی طرح کوئی سیاسی تبدیلی رونما نہ ہوئی البتہ پشاور حردان اور سوات کے ڈویژنوں میں، اے این پی، اپنے روائتی حلقوں میں ماضی کے مقابلے میں پیچھے رہ گئی کیونکہ ان علاقوں میں سرمایہ دارانہ زراعت اور تجارت کے فروغ میں جہاں سماج میں طبقاتی تفریق بڑھی ہے وہاں روائتی ڈھانچوں کا زوال تیز ہوا ہے، جس کے کارن روائتی قوم پرستی جو دقیانوسی ڈھانچوں اور دیہی زمینی متوسط پرتوں سے جڑی ہوئے ہے، زوال کا شکار ہے اور محنت کش طبقات اور نئی متوسط پرتوں میں اس کی اپیل غیر مؤثر ہے۔ جبکہ پی پی پی کی اپیل جہاں ان طبقات میں پہلے سے بڑھی ہے وہاں پختونوں کی ملک گیر ریاستی و کاروباری ڈھانچے میں شرکت کے ناطے ایک ملک گیر جمہوری پارٹی کے طور پر اس کی قبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ قومی انتخابات میں کسی ایک پارٹی کے واحد اکثریتی جماعت کے طور پر نہ ابھرنے کے کارن، آزاد ارکان جن کی تعداد ۲۷ ہے اور ایم کیو ایم کے ۱۳ اراکین نے توازن قوت میں بہت نازک اہمیت حاصل کر لی، جبکہ مضبوط اپوزیشن کے وجود میں آنے سے آئندہ تشکیل پانے والی حکومت سخت دباؤ کا شکار رہے گی۔

۱۹ نومبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج ماسوا صوبہ پنجاب کے انہی رجحانات کے مظہر رہے جن کا اظہار تین روز قبل ہو چکا تھا۔ سندھ میں پی پی پی واحد اکثریتی جماعت (۶۷/۱۰۰) بن کر ابھری جبکہ ایم کیو ایم نے شہری علاقوں میں ۲۶ نشستیں حاصل کر لیں۔ البتہ پنجاب میں قومی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج کے برعکس اسلامی جمہوری اتحاد نے ۱۰۸ نشستیں حاصل کر کے بڑی جماعت کی حیثیت لے لی جبکہ پی پی پی نے فقط ۹۴ نشستیں حاصل کیں، حالانکہ ووٹوں کے تناسب میں ابھی بھی پی پی پی آئی جے آئی سے ۰.۷۷ فیصد زیادہ تھی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

اول:۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے مقابلے میں، صوبائی انتخابات میں مقامی گروہ بندیوں، برادریوں اور ضیاء دور میں بلدیاتی اداروں کے گرد فروغ پانے والے مفادات نے زیادہ موثر کردار ادا کیا۔

دوم:۔ پی پی پی کی جو لہر قومی اسمبلی کے انتخابات میں نظر آئی، صوبائی انتخابات میں وہ پہلے کی نسبت ماند پڑ گئی۔

سوم:۔ سندھ کے انتخابی نتائج کو بنیاد بنا کر آئی جے آئی نے پنجابی شاونزم کو ابھارا۔

چہارم:۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں پیچھے رہ جانے کے بعد آئی جے آئی نے صوبائی انتخابات میں منفی ذرائع کو زیادہ مؤثر طور پر استعمال کیا جبکہ پی پی پی اپنی کامیابی کا فائدہ صوبائی انتخابات میں نہ اٹھا سکی اور اس کے پاس مؤثر صوبائی قیادت بھی نہ تھی۔

صوبہ بلوچستان میں بی این اے نے ۹ نشستیں حاصل کر کے صوبائی انتخابات میں بہتر پوزیشن حاصل کی جبکہ جمعیت العلمائے اسلام اور آئی جے آئی نے قومی انتخابات والی پوزیشن برقرار رکھی۔ صوبہ پختون خواہ میں جہاں آئی جے آئی نے ۲۸ نشستیں حاصل کر کے بڑی جماعت کی پوزیشن لے لی اور پی پی پی ۲۰ نشستیں لے کر دوسری بڑی جماعت بن کر ابھری۔ البتہ اے این پی نے جہاں ۱۲ نشستیں حاصل کر کے اپنی پوزیشن بہتر بنالی وہاں جمعیت العلمائے اسلام ۲ نشستیں حاصل کر کے کمزور پوزیشن میں چلی گئی۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کی طرح صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی ماسوا سندھ کے کوئی جماعت واحد اکثریتی جماعت کے طور پر نہ ابھر سکی خاص طور پر بلوچستان اور صوبہ پختون خواہ میں نشستوں کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ کم از کم تین جماعتیں یا گروپ مل کر صوبائی حکومتوں کی تشکیل کر سکتے تھے، جو ظاہر ہے بے اصولی گروہ بندیوں اور عدم استحکام کو جنم دینے کا باعث ہوگی۔ جبکہ صوبہ پنجاب میں آئی جے آئی کے بڑی جماعت کے طور پر ابھرنے سے آمریت نواز اور نہایت رجعتی قوتوں کو صوبائی حکومت کی تشکیل کے ذریعہ پاؤں جمانے کا موقع میسر آگیا۔

انتخابات کے منقسم نتائج اور کسی ایک جماعت کی واضح اکثریت کے نہ ابھرنے خاص طور پر آمرانہ قوتوں کے پنجاب کے صوبائی انتخابات میں برتری حاصل کر لینے کے باعث ملک کے جمہوری ڈھانچے کی تشکیل اور حکومتوں کے قیام میں آمرانہ قوتوں اور سول و ملٹری بیوروکریسی کو ایک بار پھر سازشیں کرنے کا موقع مل گیا، لیکن سندھ خاص طور پر سندھیوں کے پر زور جمہوری ووٹ پی پی پی کے چاروں صوبوں کی واحد ملک گیر جماعت کے ابھرنے اور اس کی قیادت کے جمہوری و کرشمہ ساز تصور اور پی پی پی کی مجموعی طور پر آئی جے آئی پر واضح برتری نے وفاقی حکومت کی تشکیل کے لئے توازن قوت اس کے حق میں بدل دیا۔ جہاں بیک وقت امریکی اور رائے عامہ کے دباؤ سے مرکز میں پی پی پی کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی وہاں وزیر اعظم کی نامزدگی میں تاخیر اور مرکزی و صوبائی حکومتوں کی ایک ہی وقت میں تشکیل سے آئی جے آئی کو پنجاب میں حکومت بنانے کا موقع فراہم کر دیا گیا۔ اور پی پی پی سندھ کے علاوہ پختون خواہ میں اے این پی اور آزاد اراکین کے ساتھ مل کر حکومت بنا سکی۔

اس سے یہ نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ باوجودیکہ سیاستدانوں کی اک نئی نسل ان انتخابات میں ابھر کر آئی ہے۔ دو بڑے سیاسی پلیٹ فارموں پر ماضی حاوی رہا اور مستقبل میں پاکستان کو درپیش اندرونی و بیرونی چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لئے ٹھوس لائحہ عمل اور ملک کو درپیش معاشی، سماجی، سیاسی و نظریاتی اور طبقاتی و قومیتی مسئلوں کا کوئی واضح حل سامنے نہیں آسکا۔ ایک طرف آمرانہ بنیاد پرست قوتوں اور دوسری طرف آزاد خیال جمہوری قوتوں کی واضح تقسیم کے باوجود، حالات کو معمولی ردو بدل کے ساتھ جوں کا توں قائم رکھنے کی سیاست جاری ہے۔

۲۔ قومی اسمبلی کے نتائج سے جو وفاقی حکومت وجود میں آئے گی وہ سخت دباؤ کا شکار رہے گی۔ خاص طور پر اس کا انحصار اقلیتی گروہوں پر بڑھے گا جوں جوں اس پر اپوزیشن کا دباؤ بڑھتا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے باوجود یہ اسمبلی آٹھویں ترمیم یا ۱۹۸۵ء کے آئین کو ختم کر کے ۷۳ء کے آئین کو بحال نہ کر سکے گی کیونکہ اس کے لئے ضروری اکثریت قومی اسمبلی میں مفقود ہے جبکہ سینٹ غیر جماعتی انتخابات کے دور کے ان عناصر پر مشتمل ہے جو آمریت نواز رہے ہیں۔

۳۔ سندھ میں واضح اکثریت اور ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدے کے باوجود سندھ کی حکومت ایک طرف سندھ قومی مانگوں اور مہاجروں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے مابین ٹکراؤ اور دوسری جانب پنجابی اور پشتون شاونسٹ عناصر کے دباؤ کا شکار رہے گی۔ قوم

پرست قوتوں کی شکست کے باوجود سندھی قومی مسئلہ اتنا نازک ہو چلا ہے کہ یہ قوتیں بڑھتی ہوئی مایوسی سے فائدہ اٹھا کر اچھا خاصا دباؤ بڑھا سکیں گی جبکہ ایم کیو ایم، پی پی پی سے معاہدے کے باوجود مہاجروں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو نہ پورا کر سکنے کے کارن اپنے اوپر پڑنے والا دباؤ پی پی پی پر ڈالے گی۔ مجموعی طور پر انتہائی تنگ نظر شاونسٹ رجحانات اور فاشسٹ گروہوں کے طفیل جمہوری ڈھانچہ سخت دباؤ کاشکار رہے گا۔ تاآنکہ سندھ کے قومی مسئلہ کا اور وہاں آبادی کے بہاؤ اور غیر سندھی آبادی کے ساتھ اس کے تعلقات کا معاملہ بہ احسن حل نہیں ہو جاتا۔

۴۔ پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت کے گرد آمریت نواز، رجعتی قوتوں کا مرکزی حکومت کے خلاف محاذ گرم رہے گا۔ باجودیکہ پنجاب کے حکمران طبقوں کے مفادات کا اہم حصہ پاکستان گیر ہونے کے ناطے وفاقی حکومت سے متعلق ہے اور ان کا اچھا خاصا حصہ وفاقی حکومت سے زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتا، اپنے مفادات کے حصول کے لئے یہ پنجاب حکومت کے زور پر وفاقی حکومت پر دباؤ ڈالیں گے اور حکمران طبقوں کے مابین کشمکش پہلی بار اس کھلی طرز پر پنجاب کی صوبائیت کے ناطے وفاقی حکومت کے خلاف ہوگی جبکہ وفاقی حکومت زیادہ دیر پنجاب کی جانب سے محاذ آرائی کو برداشت نہ کر پائے گی۔

۵۔ بلوچستان و پختون خواہ میں جو "فرنٹ لائن اسٹیٹ" کے "فرنٹ لائن صوبے" قرار پائے تھے میں قوم پرست قوتوں کی پسپائی اور نہایت منقسم انتخابی نتائج سے عدم استحکام کی صورت رہے گی جو ملک کے مجموعی جمہوری ڈھانچے پر بھی اثر انداز ہوگی۔

۶۔ پیپلز پارٹی کی ملک میں بڑے پیمانے پر جیت سے ایک بار پھر عیاں ہوگیا ہے کہ محنت کش عوام میں سماجی تبدیلی کی امنگ کس وسیع پیمانے پر موجود ہے اور عوام الناس کا جم غفیر انتہائی رجعت پرست اور بنیاد پرست قوتوں کے اثر و رسوخ سے آزاد ہے۔ جبکہ آزاد خیال جمہوری بورژوا عناصر اور ان کا پاپولزم عالمی سامراج اور سول و ملٹری بیورو کریسی سے وقتی تضاد کے باوجود سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے اور عوام کے لئے اس کے پاس خالی خولی نعرے بازی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کو حاصل ہونے والی پنجاب بلوچستان اور پختون خواہ میں حمایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بورژوازی کے نہایت رجعتی حصے، روایتی خواص اور وسیع متوسط پرتوں میں، آمریت پسندی، دائیں بازو کی رجعت پرستی کی کتنی وسیع سماجی بنیاد موجود ہے۔ البتہ یہ امر اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ بنیاد پرست قوتیں، روایتی خواص اور آمرانہ قوتوں کا سہارا لے

کر ہی مؤثر کردار ادا کر پائی ہیں اور ان کی آزاد سماجی بنیاد بہت محدود ہے۔ چونکہ حکمران طبقوں کا بڑا حصہ ریاستی طاقت اور آمرانہ ڈھانچے سے سمجھوتہ کر کے اپنے مفادات کا براہ راست حصول کرتا ہے۔

۷۔ انتخابات میں جہاں قوم پرست قوتوں کو عمومی پسپائی حاصل ہوئی، سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قوتیں یا قومی مسئلے کے ناطے نئی قوتیں زور نہیں پکڑیں گی، کیونکہ قومی مسئلے خاص طور پر سندھی قومی مسئلے کی شدت اور سندھ میں لسانی و قومی محاذ آرائی کے ناطے متوسط پرتوں میں حد درجے کی بڑھتی ہوئی کشاکش، وقتی طور پر ماند پڑنے کے باوجود بڑھے گی اور مرکز و صوبوں میں اختیارات اور اقتدار کی تقسیم کا سوال اور قومی مسئلہ بدستور ایجنڈے پر رہے گا۔ اسی طرح انتخابی عمل میں بائیں بازو کے عناصر کے مکمل طور پر تتر بتر ہو جانے سے نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ مزدور طبقے اور محنت کش عوام کی طبقاتی سیاست کے فروغ کے حالات مفقود ہو گئے ہیں۔ دست نگر سرمایہ داری کے ابتدائی اور ملے جلے مرحلوں اور سماجی ڈھانچوں کا بحران ہمارے ملک میں اصلاحی حل کی گنجائش کو محدود کرتا ہے، جبکہ سرمایہ داری کی کم نشو و نما اگر سوشلزم کے لئے مناسب زمین فراہم نہیں بھی کرتی ہے تو ریڈیکل جمہوری اور انقلابی تبدیلیوں کے لئے معروضی بنیاد فراہم ضرور کرتی ہے۔ لٰہذا سیاسی جمہوریت میں محنت کش طبقات کی سیاست کے فروغ کے حالات زیادہ ممد ہوں گے اور ایسے حالات میں جبکہ معاشی مسئلے بڑھتے جائیں گے اور دست نگر معاشی نشو نما کا دیوالیہ پن جو آئندہ سالوں میں کافی سنگین ہو جائے گا، بائیں بازو کی سیاست کے لئے حالات زیادہ مناسب شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ بایاں بازو خود کو اس کے لئے تیار کرے اور نئے چیلنجوں کے سامنا کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

۸۔ حکمران طبقوں میں کشمکش جس پیمانے پر ابھری ہے وہ مختلف صورتوں میں جاری رہے گی اور ظاہر ہے کہ اس بڑھتی ہوئی کشمکش کا فائدہ سول و ملٹری بیوروکریسی بڑھے ہوئے پیمانے پر اٹھائے گی اور ایسے حالات میں جبکہ آمرانہ اور انتہائی رجعت پرست قوتیں کافی طاقتور ہیں، جمہوری ڈھانچہ دباؤ کا شکار رہے گا۔ حالانکہ اس کے استحکام کے اندرونی و بیرونی عوامل اب پہلے کی نسبت زیادہ مؤثر ہوتے جارہے ہیں۔ بہر کیف ان انتخابات کے نتائج سے یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ آزاد خیال جمہوری قوتوں اور آمرانہ و بنیاد پرست قوتوں کے مابین محاذ آرائی آئندہ سالوں میں سیاسی منظر پر چھائی رہے گی، تاآنکہ حکمران طبقوں میں کوئی نیا سمجھوتہ وجود میں نہ آجائے یا پھر نئے حالات میں نئی جمہوری و انقلابی قوتیں اپنی اثر انگیزی دکھا پائیں، جو ظاہر ہے ابھی کافی بکھری ہوئی ہیں۔

ضیا کا ورثہ اور بے نظیر بھٹو کی آزاد خیال جمہوری حکومت

چیف آف آرمی اسٹاف کی جانب سے "وسیع البنیاد حکومت" کی تشکیل کی کھلی ترغیب کے باوجود، بے نظیر بھٹو نے اسلامی جمہوری اتحاد کے بغیر حکومت تشکیل کی، جیسا کہ حالات و واقعات سے ثابت ہے کہ انہیں یہ حکومت بطور "آزاد عامل" AGENT FREE کے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ انتخابات کے انعقاد کی راہ جمہوری قوتوں کے ہاتھوں آمرانہ قوتوں اور آمرانہ طاقتی ڈھانچے کی شکست سے ہموار نہیں ہوئی تھی اور جنرل ضیاء کے دور کا آمرانہ ڈھانچہ بدستور موجود تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ انتخابی نتائج نے توازن قوت زور دار طریقے سے اس حد تک نہیں بدلا تھا کہ وہ بھاری اکثریت کی مدد سے حکومت تشکیل دیتیں۔ انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو وطن واپسی سے موجود ڈھانچے کو ہی آزمانے کی حکمت عملی اپنائی تھی اور ضیا کی موت نے اس حکمت عملی کو ٹھوس صورت دینے کی واحد رکاوٹ بھی دور کر دی تھی۔ لہٰذا بے نظیر بھٹو نے فوجی قیادت اور صدر کے ساتھ ایک طرح کے تکونی اقتدار میں بعض شرائط کے ساتھ شریک ہونا قبول کیا۔ یوں انتقالِ اقتدار نہیں بلکہ شراکت اقتدار وجود میں آئی تھی، جس کا اصرار "تسلسل" پر تھا۔ مس بھٹو نے اس کا اعتراف یوں کیا کہ "ہم آئینی، سیاسی، معاشی، اور اداراتی بندھنوں کے ساتھ حکومت میں آئے ہیں۔"

آئینی طور پر ان کی حکومت آٹھویں ترمیم یا ضیاء شاہی آئین ۱۹۸۵ء کے بندھنوں میں بندھی ہے، جو صدر مملکت کو وزیر اعظم پر بھاری کرتا ہے اور قومی اسمبلی کے ہاتھ سینیٹ سے باندھتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے، جہاں اسے سمجھوتہ کے ناطے ضیا انتظامیہ کے نمبر دو اور اسلامی جمہوری اتحاد اور نوکر شاہی کے نمائندے غلام اسحاق کو صدر قبول کرنا پڑا ہے وہاں ضیاء کے دور کی غیر جماعتی اور اس کے ہمنواؤں کی سینٹ ہنوز موجود ہے، جبکہ قومی اسمبلی میں اس کا انحصار آزاد اور ایم کیو ایم کی اقلیتی گروہوں کی حمایت پر ہے اور پنجاب کے حکمران طبقوں کا بڑا حصہ وفاقی حکومت سے باہر ہے، جس کی جانب سے ایک طاقتور اپوزیشن کا سامنا ہے، جس کی پشت پر نہ صرف پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت ہے بلکہ ملک بھر کی آمریت نواز اور رجعت پرست قوتیں اور انتظامیہ کے مؤثر حلقے ہیں۔ اور ان سب سے اوپر، پس منظر میں، پرٹیورین خصوصیات کی فوج بیٹھی ہے جس نے اس ملک کی تاریخ کے دو تہائی حصہ پر مشتمل حکومت کی ہے اور اب بھی وہ اقتدار کے ڈھانچے میں سب سے طاقتور گروہ ہے۔ اداراتی طور پر یہ اسی ڈھانچے کے رحم و کرم پر ہے جو سول و ملٹری بیورو کریسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ معاشی طور پر

اسے جو تباہ حال معیشت ورثہ میں ملی ہے اور جس کے دیوالیہ پن کی شروعات مسٹر جونیجو کے آخری سال میں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ مس بھٹو نے جب اقتدار سنبھالا تو ملک ۵۲۰ ارب روپے کا مقروض تھا اور ملک سخت مالی خسارے اور توازن ادائیگی کے بیگار کا شکار تھا اور جاتے جاتے عبوری حکومت کے وزیر خزانہ مسٹر محبوب الحق عالمی مالیاتی فنڈ کے ساتھ جو شرائط طے کر گئے تھے وہ اس ملک کی تاریخ کی بد ترین شرائط تھیں۔ ایک طرف ان پر عمل درآمد کا مطلب تھا کہ ناتواں جمہوری حکومت نہ صرف عوام الناس بلکہ تجارتی و صنعتی بورژوازی کو یلغار کی دعوت دے اور دوسری طرف توازن ادائیگی کی خستہ حالت اور عالمی سامراج سے دست نگری کے رشتے، سابقہ حکومت کی جانب سے کئے گئے سمجھوتوں کو یکسر مسترد کرنے کی راہ میں مانع تھے۔ لہٰذا اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ بے نظیر حکومت نے جو پہلا چھ ماہی بجٹ پیش کیا وہ ڈاکٹر محبوب الحق کا ہی تیار کردہ تھا۔ اس طرح خارجہ امور، خاص طور پر افغانستان میں جاری فوجی محاذ آرائی اور فوجی مداخلت کا کنٹرول بھی بدستور آئی ایس آئی اور فوجی ٹولے کے ہاتھ میں تھا جبکہ دفاعی امور نئی حکومت کے لئے ویسے بھی شجر ممنوعہ قرار دیئے گئے تھے۔

مختصراً یہ کہ پاپولزم کی دوسری حکومت، مسٹر بھٹو کی حکومت سے قطعی مختلف حالات و خصوصیات کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ مسٹر بھٹو فوج کے مشرقی پاکستان میں اور بھارت سے جنگ میں شکست کے بعد توازن قوت کے یکسر ان کے حق میں بدلنے کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے تھے اور انہیں نئے پاکستان میں بھاری اکثریت حاصل تھی۔ ان کے پاپولزم میں بیک وقت اصلاح پسندی اور آمرانہ پن کی خصوصیات نمایاں تھیں، جبکہ مس بھٹو کے پاپولزم میں سامراج اور آمرانہ ڈھانچے سے سمجھوتے یا مصالحت پسندی کے پہلو نمایاں ہیں۔ مسٹر بھٹو کے آمرانہ رجحانات کی جگہ جمہوریت پسندی غالب ہے اور انہوں نے مسٹر بھٹو کی اصلاح پسندی کو یکسر ترک کر دیا ہے۔

اندریں حالات میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ہنوز طاقتی ڈھانچے میں کمزور ہے اور توازن قوت میں ابھی بھی آمرانہ انتہائی رجعت پسند اور بنیاد پرست قوتیں کافی طاقتور ہیں۔ لیکن یہ ایک نہایت پیچیدہ اور متضاد پراسس ہے۔ کیونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو جن سیاسی و سماجی قوتوں کی مدد سے برسر اقتدار آئی ہیں اور انہیں امریکی سامراج کی اشیر باد بھی حاصل ہے، وہ رفتہ رفتہ پاور اسٹرکچر میں اپنی پوزیشن مستحکم کریں گی۔ منتخب سربراہ حکومت اور قومی اسمبلی کا مرکزہ رفتہ رفتہ توازن قوت میں اپنی حیثیت مضبوط کرے گا۔ پاکستان کے موجودہ اندرونی و بیرونی حالات میں جمہوری ڈھانچے کا استحکام نہ صرف بورژوا لشو نما اور عوام الناس کے لئے ضروری ہے بلکہ عالمی اور خطے کے

حالات کا بھی یہی تقاضا ہے۔ لہٰذا بے نظیر حکومت سمجھوتے کے باوجود معروضی طور پر اور خود اپنی ضرورتوں کے تئیں مجبور ہوگی کہ نہ صرف یہ کہ جمہوری ڈھانچے کے استحکام کے لئے سرگرم ہو بلکہ اس کی لازمی بیرونی شرط یعنی خطے میں امن و استحکام کے لئے بھی کوشاں ہوں، لہٰذا اسے ایک طرف آمرانہ قوتوں کے خلاف جمہوری ڈھانچے کو مضبوط کرنا ہوگا اور دوسری طرف افغانستان خلاف فوجی محاذ آرائی اور افغان مسئلے کے فوجی حل کی جگہ پر امن سیاسی حل کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ اس ضمن میں اسے ملک بھر کی جمہوری قوتوں کے ساتھ یکجہتی اور عوام الناس پر زیادہ سے زیادہ انحصار کا طریقہ و پروگرام اپنانا ہوگا اور عالمی سطح پر امن کے حق میں پیدا ہونی والی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنیوا معاہدے پر عمل درآمد کرتے ہوئے افغانستان کے مسئلہ کا پر امن سیاسی حل تلاش کرنا ہوگا۔ جمہوری ڈھانچے کے استحکام جس کا براہ راست فائدہ محترمہ بھٹو کی حکومت کو ہوگا، بیرونی استحکام اور ہمسائیوں سے برادرانہ و پر امن تعلقات کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا ان کی حکومت کا دارومدار اس پر ہوگا کہ وہ کسی حد تک عوام الناس اور جمہوری قوتوں کو ساتھ ملا پاتی ہیں اور امن کے حق میں عالمی صورت حال سے فائدہ اٹھاکر کتنی جلد اور کسی طرح افغانستان میں فوجی مداخلت اور فوجی حل کی راہ کو ترک کرتی ہیں اور اس کے سیاسی حل کے لئے کیا پیش رفت کرتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ پاپولزم مصالحت پسندی کی طرف مائل ہے اور یہ عوام الناس پر انحصار کے بجائے سامراجی سرپرستی اور آمرانہ قوتوں سے لین دین کی جانب راغب ہے۔

ان حالات میں جبکہ آمرانہ قوتیں، عسکریت پسند حلقے، انتہائی رجعت پرست اور بنیاد پرست قوتیں خاصی طاقتور اور متحرک ہیں اور جمہوری ڈھانچہ کافی کمزور ہے، ملک میں جیسی کیسی جمہوریت کی بحالی کو ہر طریقے سے تلپٹ کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ افغانستان کے خلاف فوجی محاذ آرائی اور افغان مسئلہ کے فوجی حل پر باوجود ابتدائی ہزیمت کے زور جاری ہے (جو آئندہ عرصہ میں شکست سے دوچار ہو سکتا ہے) اور امریکی سامراج اور عالمی مالیاتی اداروں کو بدستور جدید نوآبادیاتی ریاست اور دست نگر معیشت پر بالا دستی حاصل ہے۔ ملک بھر کی جمہوری قوتوں کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ آمرانہ، بنیاد پرست، عسکریت پسند اور انتہائی رجعت پرست عناصر کے خلاف متحد ہو کر جدوجہد کریں اور جمہوری حاصلات کا نہ صرف دفاع کریں بلکہ انہیں مزید مستحکم کریں اور ابھی جو جمہوری مانگیں خاص طور سے مزدور طبقے، اقلیتں اور مظلوم قومیتوں کے حقوق اور ان کی جمہوری مانگیں تشنہ تکمیل ہیں کے حصول اور بازیابی کے لیے جدوجہد کریں۔ اس ضمن میں پاپولزم اور بے نظیر حکومت کی آمرانہ قوتوں سے سمجھوتے کی کوششوں کے خلاف

آواز بلند کرنا بھی ضروری ہو گا۔ ملک کو سامراجی غلبے، عالمی سرمایہ داری کی دست نگری اور خطے میں امریکی سامراج کے مفاد میں ضیاء دور کی فوجی مداخلت کاری اور عسکری دور خاص طور پر افغانستان کے خلاف محاذ آرائی کے خاتمے کے لئے، جو جمہوری ڈھانچے اور جمہوریت کے استحکام کے لئے لازمی شرائط ہیں، ملک بھر کے مزدور طبقے، محنت کش عوام انقلابی جمہوری وطن دوست اور ترقی پسند قوتوں کو متحد ہو کر جدوجہد کرنی ہو گی۔ سیاسی جمہوریت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے محنت کش عوام اور متوسط پرتوں کے انقلابی عناصر اور انقلابی جمہوری وطن دوست قوتوں کو منظم کرنا ہو گا۔ کیونکہ ان کی تحریک اور تنظیم کے بغیر جمہوری و وطن دوست اور ترقی پسند قوتیں، خاص طور پر مزدور طبقے اور محنت کش عوام کی انقلابی جماعت کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔

باب چہارم

انقلاب کا راستہ

پارٹی کی تیسری کانگریس ایسے موقع پر ہو رہی ہے جب عالمی مزدور تحریک اپنی انقلابی تعمیر نو کے تاریخی مرحلے سے گزر رہی ہے۔ اس مرحلے کو خصوصیت یہ ہے کہ جامد اور بانجھ عقیدہ پرستی، تنگ نظری اور موضوعی پن کے خلاف جدوجہد کی جائے اور زندہ معروضی حقیقتوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ قومی جمہوری انقلاب کے اس تصور پر بھی تجدید نظر کی ضرورت ہے جس میں بہت سادہ طور پر نوآزاد ممالک میں سوشلسٹ انقلاب سے پہلے ایک ایسے معاشرتی انقلاب کا خیال پیش کیا گیا تھا جو مبینہ طور پر ان ممالک کے معاشروں کو اچانک فوری اور معجزانہ طور پر چھلانگ کی شکل میں ماضی سے کاٹ دے گا اور قومی بورژوازی کی قیادت یا پرولتاریہ سے شراکت میں ایک ایسی انقلابی حکومت کو تشکیل دے گا جو ریاستی اور سماجی ڈھانچے کو توڑ کر نئے نظام کی بنیاد ڈالے گا، سامراجی اثر و نفوذ، جاگیرداری یا اس کے باقیات کو ختم کردے گا اور چاہے وہ ملک سرمایہ دارانہ ترقی کے کسی بھی مرحلے پر ہو غیر سرمایہ دارانہ راستہ اختیار کرے گا۔ اس طرح کے قومی جمہوری انقلاب کی بنیاد بہت سے مفروضوں پر رکھی گئی تھی۔ مثلاً یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام کی یہ "کمزور کڑیاں" بس ٹوٹا ہی چاہتی ہیں۔ سامراج دشمن جدوجہد کو لازمی، حتمی اور ناگزیر طور پر سرمایہ دار دشمنی جدوجہد فرض کر لیا گیا تھا جس کی کامیابی کے نتیجے میں مبینہ طور پر ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستے خودبخود کھل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں پیداواری قوتوں اور ثقافتی ترقی کی ان ضروریات کو بھلا دیا گیا تھا جن کو نسبتاً سرعت کے ساتھ حاصل تو کیا جا سکتا ہے لیکن جن کو حاصل کئے بغیر سوشلسٹ تبدیلی

اور ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہ "سامراج کے سکڑنے" اور "سوشلزم کے پھیلنے" کے سادہ تصور کو یہاں تک پھیلا دیا گیا تھا کہ اس کے مطابق نوآزاد ممالک کی معاشی ترقی کے لئے سرمائے اور وسائل کی فراہمی کا منبع کلیتاً سوشلسٹ ممالک کو فرض کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعے ان ممالک نے پیداواری قوتوں کی ترقی کی بنیاد ڈالنے اور آگے بڑھنے TAKE OFF کا مرحلہ طے کرنا تھا۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مختلف ماڈلوں کی چکاچوند کا شکار مقامی، سماجی، تاریخی اور ثقافتی حالات کی خصوصیات اور ضروریات کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ ترقی کے مرحلے اور ماہیت کو نظر میں نہیں رکھا گیا اور یہ کہ پاکستان میں سماجی ساخت سے کم واقفیت کی وجہ سے ایسے سامراج دشمن اور جاگیر دار دشمن موثر قومی بورژوازی کے وجود کو فرض کر لیا گیا تھا جو قومی جمہوری انقلاب کی قیادت کرتی یا مستقل مزاجی سے کھڑی رہتی لیکن مزدور طبقے کو عمل میں اور سماجی ساخت کے سائنسی مطالعے میں اس طرح کی "انقلابی قومی بورژوازی" سے واسطہ نہیں پڑا۔

زندگی کے تجربے نے ان مفروضوں اور فارمولوں کی کمزور بنیادوں کو آشکار کر دیا

ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ پرولتاریہ اور محنت کش عوام کو سوشلسٹ انقلاب سے پہلے اس طرح کے عبوری انقلابات کے وہم میں مبتلا نہ کیا جائے جو نہ سوشلزم ہو اور نہ سرمایہ داری۔ بلکہ پاکستان میں ایک ایسے سوشلسٹ انقلاب کی حکمت عملی بنائی جائے۔ جو ہمارے ملک کی معاشی و طبقاتی ساخت، ترقی کے تاریخی دور اور بین الاقوامی معاشی و سیاسی تعلقات کے مطابق ہو اور جسے پرولتاریہ اور محنت کشوں کی پارٹی اپنی قیادت میں پیٹی بورژوا پروفیشنلز اور درمیانے طبقے کے عناصر کو اپنے ساتھ جوڑ کر برپا کرے گی۔ ایسی انقلابی تبدیلیاں سرمایہ داری سماجی نظام کی پیش رفت میں خامیوں کو درست کرتے ہوئے سماجی ترقی کا رخ سوشلسٹ نظام کی طرف موڑ کر ریاستی مشینری اور سماجی نظام کو یکسر بدلنے کے لئے انقلابی اقدامات کریں گی۔ پارٹی سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظاموں کے درمیان بیچ کے تیسرے نظام کی تصور کو رد کرتی ہے اور اسی لئے وہ سوشلسٹ انقلاب کی حکمت عملی بناتی ہے۔ لیکن ہم نہ تو اپنے تئیں سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء کو منفی اور عوام کے مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں اور نہ سوشلسٹ نظام کے ابتدائی مرحلوں کی معروضی و موضوعی ضروریات اور تقاضوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ تو سرمایہ داری نظام کا خاتمہ اذن عزرائیل ہے اور نہ ہی سوشلسٹ نظام کا قیام صور اسرافیل جو یک لخت واقع ہو جاتا ہو۔

ہماری پارٹی سوشلسٹ انقلاب کی حکمت عملی تو بناتی ہے لیکن اس کے لئے فوری

طور پر کال نہیں دیتی کیونکہ اس انقلاب کے بپا ہونے کے حالات ابھی میسر نہیں ہیں۔ اس کے لئے معروضی و موضوعی ضروریات پورا کرنے کے لئے لمبے اور پر پیچ و خم راستے سے گزرنا ہوگا۔ یہ راستہ "آزاد سماجی و معاشی ترقی" جو کہ مختلف مراحل سے گزرنے والا ایک مسلسل عمل ہے، ایک تسلسل کا راستہ ہے اور جس کے کئی مرحلے ہوسکتے ہیں۔ مختلف مراحل کی اپنی اپنی خصوصیات اور مختلف نعرے ہوں گے۔ ان سب مرحلوں کے لئے ابھی سے کوئی لگا بندھا فارمولا متعین نہیں کیا جاسکتا جو پارٹی کو مستقل طور پر باندھ لے۔

مزید برآں علاقائی صورت حال میں تبدیلیوں، موجودہ بحران زدہ سماجی و سیاسی نظام کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور ریاست کے اضافی کردار و اقتصادی و سماجی ساخت کی اپنی خصوصیت کے نتیجے میں آئینی، سیاسی و معاشی بحرانات کے امکانات موجود ہیں۔ ایسے بحرانوں کے نتیجے میں ریڈیکل سیاسی تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں۔ ظاہر ہے پارٹی ایسی صورتحال میں اپنے تاریخی و انقلابی فرائض پورا کرنے کے لئے تیار ہوگی اور پارٹی اپنی ماہیت اور حیثیت کو آزاد برقرار رکھتے ہوئے مخلوط حکومتوں کے لئے بھی تیار رہے گی۔

پارٹی آزاد سماجی و معاشرتی ترقی کا راستہ اس لئے اپناتی ہے کہ ماقبل سرمایہ داری ڈھانچوں کی باقیات اور نوآبادیاتی ورثے کی ثقافتی پسماندگی ختم ہو، وسیع اور تیز رفتار صنعتی ترقی ہو۔ ہمارے جیسے ممالک میں بورژوا طبقے کی تاریخی کمزوریوں کے سبب آزاد جمہوری ریاست کے قیام اور بورژوا جمہوری انقلاب کی تکمیل کے فرائض کے سلسلہ میں پرولتاریہ اور محنت کش عوام پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

قومی جمہوری انقلاب کے بجائے آزاد سماجی و معاشرتی ترقی کی راہ کی اصطلاح سے یہ معنی نہیں اخذ کرنے چاہئیں کہ پارٹی کا کام کسی طرح آسان ہوگیا ہے۔ بلکہ پارٹی کا کام اس لیے زیادہ کٹھن ہوگیا ہے کہ اب اسے بنیادی طور اپنے طبقے پر انحصار کرنا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پارٹی کو بہ حیثیت مجموعی اور اس کے ہر ساتھی کو اور زیادہ اولولعزمی، نظریاتی و سیاسی شعور کے ساتھ محنت کش عوام کی تنظیم کاری کرکے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ہوگا اور اپنے اتحادی طبقات اور پرتوں میں اپنے اثر و نفوذ کو بڑھانا ہوگا۔

آزاد سماجی و معاشرتی ترقی ایک مسلسل عمل ہے جس کا رخ سامراج، جاگیردارانہ باقیات اور مقامی رجعت پسند قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کی جانب ہے۔ پاکستان میں سیاسی آزادی کو مستحکم کرنے اور معاشی آزادی اور جمہوریت کے حصول کے لئے

سامراجی غلبے کو ختم کرنے اور قومی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے، کسانوں کے حق میں جمہوری زرعی اصلاحات، پیداواری قوتوں کو ترقی دینے، محنت کش عوام کی ثقافتی زندگی کی سطح بلند کرنے اور حکومتی و ریاستی معاملات میں ان کی وسیع شرکت کو یقینی بنانے اور مختلف قوموں کی حق خود ارادیت بشمول حق علیحدگی کی بنیاد پر آزادانہ قومی ترقی کے حالات فراہم کرنے کے لیے کام کرنا ہے۔

آزادانہ سماجی و معاشی ترقی پر پیش رفت کے لیے پارٹی سیاسی و اقتصادی میدان میں جدوجہد کرے گی۔ تاکہ مادی و انسانی وسائل کو درست طور پر استعمال میں لایا جا سکے۔ ملکی معیشت پر کنٹرول کے لیے سامراجی ریاستوں اور اداروں کے احکامات کو قبول نہ کیا جائے۔ جدید ٹیکنالوجی کے حصول پر توجہ دی جائے۔ سرمائے اور وسائل کے روایتی بین الاقوامی منبعوں کے علاوہ کم تر برائی کے طور پر تیل پیدا کرنے والے اور تیسری دنیا کے نسبتاً متمول ممالک کی طرف رجوع کیا جائے۔ مختلف سامراجی مراکز کے درمیان پائے جانے والے تضادات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ علاقائی دو طرفہ اور برابری کے بنیاد پر تعاون کے تمام امکانات کو بروئے کار لایا جائے اور سوشلسٹ ممالک کے ساتھ تجارت اور اقتصادی تعلقات کو بڑھایا جائے۔

پاکستان کے آج کے حالات میں عالمی سامراج سے جڑے ہوئے رجعت پسند حکمران طبقوں یعنی بڑے سرمایہ دار، بڑے زمین دار اور نوکر شاہی کے اوپری حصے نے لمبے عرصے تک عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم رکھا اور جرنیل شاہی آمریتوں کو ملک پر مسلط کئے رکھا۔ جس نے ملک کو سنگین معاشی، سماجی و سیاسی اور اخلاقی بحران میں مبتلا کیا ہے۔ اس لیے آج کا اہم تضاد عالمی سامراج سے جڑے ہوئے رجعت پسند مطلق العنان حکمران حلقوں اور وسیع عوامی اور جمہوری قوتوں کے درمیان بنتا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت اور مطلق العنانی وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہے اور آج بھی یہ خطرات اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس لیے جرنیل شاہی آمریتوں کی باقیات کے خاتمے اور عوام کے وسیع حصوں کی شرکت سے جمہوری سیاسی نظام کو مستحکم بنانے کی جدوجہد آج کے حالات میں زبردست اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ سامراجی مفادات پر فوری اور دور رس ضرب پڑنے کے نتیجے میں سامراجی ریاستیں اور ادارے پاکستانی معیشت پر کنٹرول کی وجہ سے کوئی معاشی و سیاسی بحران پیدا کر سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مطلق العنانی پھر سے طاقت پکڑ سکتی ہے۔ ایسی صورت حال سے جمہوری قوتوں کا موثر اتحاد ہی نمٹ سکتا ہے۔ موجودہ نئی بین الاقوامی فضاء نے پاکستان میں موجود تمام موجود مشکلات

کے باوجود ایک جمہوری سیاسی نظام کے دور مدت امکانات کو روشن تر کر دیا ہے۔ جس سے موثر اور صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جمہوری سیاسی نظام محنت کش عوام اور کچلے ہوئے دیہی و شہری غریبوں اور مظلوم قوموں کو اپنے حقوق کے حصول اور انقلابی سماجی تبدیلی کے لیے منظم کرنے اور جدوجہد کرنے کے مساعد حالات فراہم کرتا ہے۔

پرولتاریہ اور محنت کش عوام کی رہنمائی میں مزدوروں کسانوں دیہی و شہری غریبوں کے بے رحمانہ استحصال کے خلاف کی جانے والی سیاسی و معاشی مستقل مزاج جدوجہد آزاد سماجی ترقی کے راستے کی لازمی خصوصیت ہے۔ ان طبقات کے طبقاتی شعور اور تنظیم کی سطح کو مسلسل بڑھاوا اس راہ کی ایک ضروری شرط ہے جس کے بغیر موجودہ استحصالی سماجی و معاشی نظام کا بالآخر خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

پاکستان میں موجود نئے نوآبادیاتی استحصالی سماجی ڈھانچے نے جہاں فرد کے ہاتھوں فرد کے استحصال کو عام کیا ہے، وہاں چھوٹی قوموں کے عوام کو دوہرے استحصال کا شکار بنایا ہے۔ ناہموار معاشی ترقی اور ملک کے ایک حصے کی فوج اور بیوروکریسی کے مطلق العنان سیاسی اقتدار نے قومی تضاد کو پچھلے عرصے میں شدت بخشی ہے۔ مطلق العنانی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں قومی مسئلہ مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ پارٹی کے نزدیک قوموں کے حق خود ارادیت کے مطالبے کے بغیر جمہوری جدوجہد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری رائے میں کثیر الاقوام پاکستان کو خود مختار ریاستوں کا اتحاد UNION OF AUTONOMOUS REPUBLICS بننا چاہیے۔

قومی حقوق کی جدوجہد میں مختلف قوموں کے مخصوص حالات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ پارٹی کی جڑیں عوام کی تاریخ، ثقافت، ادب، روحانی زندگی اور مذہبی روایات میں پیوست ہونی چاہئیں۔ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی ترویج اور انقلابی جدوجہد میں ان کے کردار پر خاص توجہ دی جانی چاہیے۔ پارٹی کو سنجیدگی سے نیا سیاسی طریقۂ کار اپنانا ہوگا۔ جس میں صورت حال کے مطابق عمل کرنے اور کام کرنے کے لیے کھلے اور قانونی ذرائع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا پہلو بھی مد نظر رکھا جائے۔

آزاد سماجی و معاشرتی ترقی کے لیے راستے کے مقاصد کے حصول میں جو بنیادی طور پر جمہوری اور سامراج دشمن مقاصد ہیں مزدور طبقے اور محنت کش عوام کے علاوہ دیگر سامراج دشمن اور محب وطن سماجی طبقوں اور پرتوں کا مفاد بھی مضمر ہے جس سے ان

نوتوں کی مشترکہ جدوجہد کی بنیاد فراہم ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے مختلف اوقات
میں مختلف قسم کے متحدہ محاذ اور مشترکہ عمل کے طریقے وضع کئے جاتے رہیں۔

باب پنجم

تنظیمی رپورٹ

پاکستان کی آج کی اشتراکی تحریک اپنے مرحلہ وار ارتقائی پیش رفت کا نتیجہ ہے
دوسری اور تیسری کانگریس کے درمیانی مرحلے کی صورتحال اور آج کے تقاضوں کو سمجھنے
کے لیے دوسری کانگریس سے پہلے کی صورتحال کا جائزہ کچھ یوں ہے کہ پاکستان بننے کے
بعد سابقہ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں موجود کمزور تحریک کے سرکردہ کیڈر کے
ہندوستان چلے جانے سے رہی سہی تحریک مزید کمزور ہوگئی تھی۔ پارٹی کے تین
ڈیلیگیٹس (DELEGATES) پر مشتمل پہلی کانگریس (کلکتہ کانگریس) صرف تسلسل او
قانونیت کا اظہار تھا جس کے بعد پارٹی بنانے کی مسلسل سعی و کوشش کی گئی۔ ابتدائی
ڈھانچہ جو تھوڑا بہت بنا وہ ۱۹۵۱ کی "پنڈی سازش کیس" کی گرفتاریوں نے توڑ دیا۔ ۱۹۵۱
کے بعد دوبارہ بنا ہوا ملک گیر ڈھانچہ ۱۹۵۴ کی پارٹی پر پابندی نے ختم کر دیا۔ اور یوں
۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ کے سات سالہ پہلے دور میں پارٹی جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی۔ پارٹی
تنظیم کسی حد تک صرف سندھ میں باقی رہ گئی۔

اس دور میں تحریک پر متحدہ ھندوستان کی سیاسی جدوجہد کا مزاج اور رنگ حاوی
تھا۔ جو ھندوستانی کانگریس تحریک اور اسٹالنیٹ طریقہ کار ملاپ سے بنا تھا۔ پاکستان
کے سماجی ڈھانچے میں موجود رجحانات اور سامراج سے جڑنے کے امکانات پر توجہ نہ رہی
اور نہ ہی موجودہ پاکستان کے نفسیاتی، سماجی و ثقافتی میلانات پر نظر رہی۔ پاکستان بنتے
وقت ٹریڈ یونین میں پارٹی کا کام کسی حد موجود تھا۔

پارٹی پابندی کے بعد ۱۹۶۸ کی سندھ کانفرنس تک کا چودہ سالہ دوسرا دور انتہائی مصیبتوں اور کٹھن جدوجہد کا دور رہا۔ اس دور میں سندھ پارٹی کے بانیوں نے عزم و جدوجہد کا مظاہرہ کیا اور بین الاقوامی اور نظریاتی مسائل پر درست مؤقف اختیار کیا۔ اس دور میں پاکستان میں ماؤسٹ رجحانات عروج پر پہنچے جس نے مزدوروں اور کسانوں اور نچلے درمیانے طبقے کے بڑے حصے کو متاثر کیا جبکہ پارٹی عوام سے کٹی اور الگ تھلگ رہی۔ ۱۹۶۸ کی سندھ کانفرنس سے پارٹی کا دوسری کانگریس (۱۹۷۵) تک کا سات سالہ تیسرا دور ملک گیر پارٹی بننے کا تھا۔ اس عرصے میں پارٹی کا ڈھانچہ ملک گیر سطح پر بننے لگا۔

دوسری کانگریس :-

۱۹۷۵ میں دوسری کانگریس کے انعقاد کے وقت، ۲۸ سال کے وقفہ کے بعد پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کی نوعیت کچھ اس طرح تھی کہ پارٹی تنظیم بہت مختصر تھی لیکن تحریک بڑی تھی۔ ملک کے مختلف شہروں علاقوں اور صوبوں میں بہت سارے منتشر حلقے موجود تھے۔ علاقائی اور قومی گروہ زیادہ مؤثر تھے۔ ماؤسٹ اور پیٹی بورژوا رجحانات زوال پذیر تھے۔ اور ایسے حلقے صحیح اور سائنسی طرزِ فکر کی طرف مائل ہو رہے تھے۔

دوسری کانگریس کے وقت پارٹی کی ممبر شپ بہت کم تھی۔ سندھ کے علاوہ دوسرے صوبوں میں پارٹی تنظیم کی ابتداء تھی۔ سندھ میں پارٹی کا کام طالب علموں اور ہاریوں میں تھا۔ دوسری کانگریس نے پارٹی پابندی کے بعد دوبارہ پارٹی منظم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ کانگریس نے کمیونسٹ تحریک کو ایک رخ پر ڈالا۔ اس میں اعتماد پیدا کیا اور نیا ملک گیر ڈھانچہ بنانے میں مدد دی جس سے مستقبل کی مؤثر تحریک بن سکتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو حلقے سائنسی طرز فکر کی طرف راغب ہو رہے تھے ان کو سمیٹ کر منظم کیا جاتا، لیکن کانگریس سے پہلے کے ۲۸ سالہ حالات اور واقعات کا پارٹی پر گہرا اثر تھا۔ یہ خوف کہ ایسے عناصر کی شمولیت تنظیم کو پھر سے منتشر نہ کرے، غالب تھا اور دوسری طرف عوام سے کٹے رہنے اور نتیجتاً خفیہ سوسائٹی بننے کی وجہ سے تنگ نظری حاوی رہی۔ نیا اندازِ فکر، نیا اسٹائل اور معروضی حالات کے تقاضوں کے مطابق تنظیمی پیش رفت عقیدہ پرستی کی نذر ہوئی۔ مزدوروں، کسانوں اور عوام کی دوسری پرتوں کے لیے کام کے اسٹائل کو زیرِ زمین رہنے کی نفسیات سے جوڑا گیا جس کے نتیجے میں پارٹی عوام سے مزید کٹ گئی اور مصنوعی صورتحال اور معروضی حالات کے درمیان

فاصلہ مزید بڑھ گیا۔

دوسری کانگریس کے لیے مندوبین کا انتخاب جمہوری انداز سے ہوسکتا تھا۔ جو سیکورٹی کی طرف حد سے زیادہ حساس ہونے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اور مندوبین کی تعداد تقریباً تیس (۳۰) تھی جو زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔

دوسری کانگریس کے بعد:-

دوسری کانگریس ۱۹۷۵ کے بعد پارٹی اور کمیونسٹ تحریک میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں جو پارٹی کے اپنے تجربے اور اندرون و بیرونِ ملک وقوع پذیر حالات و واقعات کا نتیجہ تھیں۔ اپریل ۱۹۷۸ کے افغان انقلاب اور فروری ۱۹۷۹ کے شاہ دشمن ایرانی تبدیلی نے پاکستان کی تحریک پر گہرے اور دوہرے اثرات مرتب کیے۔ کمیونسٹ تحریک میں ماؤنسٹ رجحانات تقریباً ختم ہوئے اور مختلف گروپوں میں عملی سیاست اور موقف میں یکسانیت پیدا ہوئی۔ پارٹی کیڈر میں آہستہ آہستہ اگر ایک طرف رومانیت کی بجائے حقیقت پسندی، اعتماد اور معروضی حالات کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا احساس پیدا ہوا تو دوسری طرف پہلے سے موجود انتہاپسندانہ اور تنگ نظری مزید گہری ہوئی۔

مئی ۱۹۷۸ میں مہم جوئی پر مبنی "چار نکاتی پروگرام" دیا گیا۔ جس میں پارٹی کی قیادت میں طبقاتی اور سماجی تنظیموں کو اقتدار سنبھالنے کے لیے تیاری کی کال دی گئی تھی جس نے پارٹی کی تنظیم اور سیاست پر مضر اثرات مرتب کیے۔

افغانستان میں تو دسمبر ۱۹۷۹ میں حفیظ اللہ امین کے اقتدار کے خاتمے سے انتہا پسندی اور تنگ نظری کو شکست ہوئی لیکن تمام تیسری دنیا کے ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مہم جوئی کے اس گہرے رجحان پر بروقت قابو پایا نہیں گیا اور نہ ہی یہ احساس پیدا ہوا۔ حفیظ اللہ امین کی قوم پرستی کے رجحان کو پارٹی نے درست طور پر تنقید کا نشانہ بنایا لیکن انتہاپسندی اور تنگ نظری کے اس رجحان کے خلاف پارٹی میں جنگ نہیں لڑی گئی۔ جس کے بعد میں خطرناک اثرات مرتب ہوئے۔

جولائی ۸۰ میں پارٹی کے کچھ چیدہ چیدہ ساتھی گرفتار ہوگئے۔ کامریڈ جام ساقی پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ کچھ ساتھی ملک سے لمبے عرصے کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ گرفتاری کے بعد تشدد کی وجہ سے کامریڈ نذیر عباسی شہید ہوگئے۔ پختونخواہ کے ڈاکٹر تاج دائیں بازو کے انتہا پسندوں کے دہشت پسندی سے شہید ہوگئے۔ ان گرفتاریوں کیوجہ سے پارٹی تنظیم میں کوجود تسلسل ٹوٹ گیا۔ نئے ساتھیوں نے پارٹی امور کو سنبھالا۔ لیکن

جیل، ملک سے باہر اور ملک میں موجود ساتھیوں کے تین مرکز کے وجود میں آنے کیوجہ سے سیاسی اور عملی فیصلے کرنے میں دشواریاں پیدا ہوئیں اور معروضی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے پیش رفت نہ ہو سکی۔ ۱۹۸۲ میں پارٹی اور دیگر چار مارکسی گروپوں کے درمیان ایک مارکسی رابطہ کمیٹی (ایم سی سی) بنی۔ بعد میں سوائے ایک باقی تنظیمیں پارٹی میں ضم ہو گئی۔ ایم سی سی نے پارٹی کی بڑھوتری اور معروضی و موضوعی حالات کے درمیان فاصلہ کم کرنے اور مشترکہ تجربات کے نتیجے میں آگے بڑھنے میں بہت مدد دی۔ پارٹی میں موجود ہچکچاہٹ اور بے لوچ فکر نے اس عمل کو مزید بڑھنے نہیں دیا۔ پنجاب کے پرانے ساتھیوں نے نئے ساتھیوں کو اعتماد میں لینے کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی اور گروہ بندی کی کوششیں کیں۔ پھر بھی تین سالوں میں پارٹی ممبروں کی تعداد میں ۱۸ گنا اضافہ ہوا۔ جولائی ۸۵ کے پلینم میں سہ رخی پالیسی بنائی گئی۔ جس میں ملک کی عمومی جمہوری، سامراج دشمن اور مزدور طبقے کی تحریک کو آپس میں مربوط طور پر آگے بڑھانے کی لائن تھی۔ لیکن مرکزی کمیٹی کے ارکان کی اس پالیسی کے بارے میں اپنی اپنی تشریح تھی۔ جس کی وجہ سے اس صحیح لائن کے نتیجے میں وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے جو ہونے چاہیے تھے۔

۸۶ میں مرکزی کمیٹی کے زیادہ سے زیادہ ارکان اکٹھے مل بیٹھے اور یہ امید تھی کہ آپس میں موجود نقطۂ نظر کے اختلاف کو مارکسی ۔ لیننی اور جمہوری انداز سے ختم یا کم کیا جاسکے۔

لیکن بے لوچ اور بے لچک موضوعی سوچ اور رجحان نے پارٹی توڑنے کا رویہ اپنایا۔ جنوری ۸۷ کے مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں نظریاتی سیاسی و تنظیمی سوالات (جس کی نشاندھی مرکزی کمیٹی نے پہلے کی تھی) پر نکتہ نظر بنانے کی بجائے "جائزہ اور خود تنقیدی" کے نام پر ۸۰ کے بعد کی پارٹی کی مثبت پالیسیوں اور اہم اقدامات کے خلاف محاذ کھول دیا گیا۔ جس میں پارٹی میں دیگر مارکسی۔ لیننی تنظیموں کے انضمام اور کمیونسٹ ایکتا کو تحلیل پسندی، وسیع تر قومی جمہوری محاذ پر پیش رفت کو دُم چھلا پن، قومی سال پر اصولی، حقیقت پسندانہ اور لچکدار موقف کو قومی شاونزم، پارٹی کی نشو نما کو لبرل بورژوا رنگ، جمہوری مرکزیت اور اندرونِ پارٹی جمہوریت میں اصرار اور اداراتی ورکنگ کو مرکز سے غداری اور پارٹی کی محنت کش عوام میں اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے اتحادیوں کے ساتھ متحدہ جدوجہد کو پارٹی پر اعتماد میں کمی قرار دیا گیا۔ مرکزی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ "جائزہ اور خود تنقید" مرکزی کمیٹی کی اکثریتی رائے اور دوسری رائے جو "جائزہ اور مستقبل" کی صورت میں آئی کو اقلیتی رائے کے طور پر بیک وقت پارٹی میں تقسیم کیا

جائے گا اور تمام پارٹی کے اراکین کی رائے حاصل کی جائے گی۔ پارٹی میں ایک طرف سے مرکزی کمیٹی کے اس فیصلے کو رد کرنے کی وجہ سے مرکزی کمیٹی سیاسی رہنمائی اور تنظیمی فرائض میں ناکام ہوئی، چنانچہ چاروں صوبائی کمیٹی مطالبے، خارجہ کمیٹی کی حمایت اور مرکزی کمیٹی کی اکثریت کے اتفاق و تائید سے مرکزی توسیعی اجلاس بلانے کی ضرورت تھی، جسے مرکزی جنرل سکریٹری نے مسترد کر دیا۔ اس سنگین بحران پر قابو پانے کے لئے، پارٹی آئین کی رو سے، مرکزی توسیعی اجلاس جس میں مرکزی کمیٹی اور صوبائی کمیٹیوں کے ارکان شامل تھے، بلایا گیا، جس کو مرکزی کمیٹی کے تقریباً نصف، صوبائی کمیٹیوں کے تین چوتھائی اور پارٹی ارکان کی ۹۷ فیصد اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ مئی ۸۷ کے بعد مرکزی توسیعی اجلاس پارٹی کا آئینی اور قانونی مرکز بن گیا، جس نے تیسری کانگریس کا انعقاد کرنا ہے۔ تیسری کانگریس کے سامنے دوسری کانگریس کے بعد کی صورتحال کو معروضی اور موضوعی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ تنظیمی فرائض بنتے ہیں، جس کو پورا کرنے کے لئے ان مقاصد کی روح کو حصوں میں نہیں بلکہ کلیتاً سمجھنا ضروری ہے۔ مرکزی توسیعی اجلاس نے مختصر عرصے میں کانگریس منعقد کرانے کے لئے شیڈول دیا گیا تھا تاکہ موجود اتفاق رائے پر تنظیمی صورتحال درست کی جائے۔ اور بڑے اقدامات کے لئے پارٹی فیصلہ موجود ہو۔ لیکن چار پانچ مہینے کے شیڈول کی بجائے تقریباً دو سال بعد کانگریس کا انعقاد ہو رہا ہے۔ مزید براں اس دوران پارٹی کیڈر کو سیاسی اور تنظیمی رہنمائی بھی نہ ملی خصوصاً انتخابات کے بارے میں پارٹی لائن درست ثابت نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ سے کیڈر میں بد دلی اور مایوسی پیدا ہوئی۔ یہ اپنی جگہ پر درست ہے کہ سماجی ساخت پر چالیس سال میں کام نہیں ہوا اور مسائل پیچیدہ ہیں جن میں سائنسی انداز سے نقطہ نظر بنانے میں دشواریاں ہیں۔ لیکن کانگریس کا انعقاد اور سیاسی رہنمائی فراہم کرنا، شکوک و شبہات سے پاک مکمل تفصیلات کے ساتھ سیاسی پروگرام کے طے ہوجانے سے زیادہ اولیت کا کام تھا۔

پہلے مرکزی توسیعی اجلاس کے وقت نظریاتی، سیاسی اور تنظیمی مسائل پر کوئی زیادہ واضح اور متفقہ نقطہ نظر موجود نہیں تھا۔ کیونکہ تقسیم سے پہلے ان مسائل پر پارٹی میں بحث و تمحیص نہیں ہوئی تھی۔ "جائزہ اور مستقبل" اور "جائزہ اور خود تنقیدی" دونوں ڈاکومینٹس پر ساتھیوں کا اتفاق یا اختلاف عمومی تھا۔ لیکن بعد میں ان دو سالوں میں رسمی و غیر رسمی مباحثوں کے نتیجے میں پارٹی میں کافی حد تک اتفاق رائے بنا ہے۔ مزید اور مکمل اتفاق رائے کے لئے مستقبل میں کانفرنسوں اور مباحثوں کی

ضرورت ہے۔

تقسیم کے بعد پارٹی نے جام جمال گروپ کو پھر سے متحد ہونے کے لیے قابل عمل اور مناسب تجاویز پیش کیں تھیں جو جام جمال گروپ کی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پارٹی دیگر مارکسی گروپوں کے ساتھ روابط قائم رکھے ہوئے ہیں۔ پشتون اولسی تحریک اور پختونخواہ کا ایک گروپ پارٹی میں ضم ہوئے ہیں۔ پارٹی کو مستقبل میں موجود مارکسی گروپوں کے ساتھ مربوط CO ORDINATION بنانا ہے تاکہ ایسے تمام گروپس اور عناصر پارٹی میں منظم ہو کر ایک موثر کردار ادا کر سکیں۔

پارٹی آئین ایک ایسی بنیادی دستاویز ہے جو پارٹی ممبر کو پارٹی میں رہنے، کام کرنے اور اس کے حقوق کے تحفظ کے لئے ضمانت فراہم کرتا ہے۔ پارٹی آئین پر عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ سے ساتھی، لیڈروں اور آرگنائزروں کے ذاتی رحم و کرم پر رہ جاتے ہیں۔ دوسری کانگریس میں منظور شدہ آئین پہلی کانگریس کے آئین میں چند الفاظ کی ترامیم کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا جو متحدہ ہندوستان کے وقت کے حالات کے لئے تھا۔ دوسری کانگریس کے بعد منظور شدہ آئین نہیں چھپ سکا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں آئین پارٹی کے کچھ حلقوں تک پہنچا۔ پارٹی میں بتائے بغیر عارضی ممبران کا وجود بھی تھا۔ گروپ ممبر غیر آئینی طور پر سالہاسال امیدوار ممبری اور پارٹی ممبر شپ سے محروم رہتے تھے۔ پارٹی ادارے منتخب ہونے کی بجائے بالائی اداروں کی جانب سے نامزد ہوتے تھے۔ پارٹی برطانوی غیر تحریر شدہ آئین کی طرح روایات پر چلتی رہی۔ تیسری کانگریس کے بعد پارٹی ممبران کو اپنے حقوق و فرائض آئین سے اخذ کرنے چاہئیں۔

آج تنظیم کاری ایک سائنس ہے، اداراتی فنکشننگ جس کا لازمی جزو ہے جن کو آپس میں مربوط کر کے بہتر کارکردگی اور بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ افراد پر رحم و کرم کی بجائے پارٹی کو اداراتی کام اور مختلف شعبوں میں تخصیص کی طرف اقدامات کرنے چاہئیے۔ ابتدا میں شعبہ جاتی کام زیادہ نتائج نہیں دے سکے گا، کیونکہ پارٹی میں ابھی تک مستعد کیڈر جذب نہیں ہو سکا ہے۔ یہ ادارے اتنے ہی فعال اور موثر ہوں گے جتنا پارٹی میں مستعد کیڈر جذب ہونے کا عمل تیز ہوگا۔ نتیجتاً مستعد کیڈر کے جذب ہونے کا عمل اور تربیت اور شعبہ جاتی کام ایک دوسرے کو جدلیاتی طور پر مضبوط بناتا جائے گا۔

دوسری کانگریس کے بعد پارٹی ممبروں سے ڈسپلن کا توقع کی جاتی تھی جبکہ بالائی اداروں میں ڈسپلن کی فقدان تھا، جسے خفیہ سوسائٹی کے کلچر اور آئین کی عدم اشاعت نے فروغ دیا تھا۔ ڈسپلن کے معیار بھی زیادہ تر طے کردہ اصولوں کے بجائے پسند ناپسند کی بنیاد پر متعین تھے، جو "رانگ سائیڈ" پر لا کر وار کرنے پر مبنی تھے۔ مختلف صوبوں

اور علاقوں میں ڈسپلن ایک طرح کا نہیں بلکہ انچارج کی مرضی اور مزاج پر منحصر تھا۔ تیسری کانگریس کو ماس پارٹی اور کیڈر پارٹی، قانونی و غیر قانونی پارٹی، زیر زمین پارٹی اور اوپن پارٹی کے مابین ڈسپلن کے فرق کو مدّ نظر رکھنا چاہئیے اور یہ کہ مختلف اوقات میں ترجیحات کی مناسبت سے لچکدار روّیہ اپنانا چاہئیے۔ پارٹی میں فرق کے ساتھ سوچ، رجحان اور انداز رکھنے والے ساتھیوں کو ایک ساتھ چلنے اور ڈسپلن کے عمومی اصولوں پر پابند رہنے کی روایت کو مضبوط بنانا چاہئیے۔ ڈسپلن شعور اور کمٹ منٹ پر مبنی ایک ایسا مظہر ہے جو طے شدہ مقاصد کے حصول کے لئے یکسوئی سے عمل کے لئے ضروری ہے۔ ڈسپلن صرف ٹائم پر اجلاس میں حاضری کا نام نہیں ہے اور نہ صرف دیئے گئے کام کو بروقت پورا کرنے کا نام، بلکہ سیاسی سماجی اور نجی زندگی میں انقلابی شخصیت کے مربوط طرز حیات کا نام بھی ہے۔ انقلاب اور انقلابی عمل میں کامیابی کے لئے صرف کمٹ منٹ اور ریاست بازی کافی نہیں ہوتی، یوں انقلابی عبادت تو کی جاسکتی ہے۔ انقلاب نہیں۔ پارٹی کیڈر کو اچھی کوالٹی اور عوام میں ان کے اثر و نفوذ کے بغیر انقلاب ایک خیالی تصور ہے۔ دوسری کانگریس کے بعد ابھی تک پارٹی میں نہ اس طرف توجہ دی گئی ہے نہ ہی ایسے موقع فراہم کئے گئے ہیں جس میں ٹیلنٹ پارٹی کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ ویسے بھی پاکستان میں (TALENTS) کے لئے موجودہ سسٹم میں کھپ جانے کے موقع کافی ہیں۔ موجودہ سسٹم سے متعدد عناصر کے علاوہ باشعور افراد کے پارٹی میں کام اور مواقع نکالنے کی ضرورت ہوگی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ساتھیوں کی تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ صرف روزمرہ کی بھاگ دوڑ کرنے والے بن کر نہ رہ جائیں جو صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتے ہوں بلکہ ان میں پارٹی کے کام میں شراکت اور اپنے کام کی اہمیت کا احساس ہو۔ گزشتہ عشرے میں پاکستان میں آزادانہ طور پر سائنسی طرز فکر اور مارکسزم کی طرف مائل افراد کی ایک بڑی تعداد وجود میں آئی ہے۔ جو پارٹی کی تنگ نظری اور بے لچک روّیے کی وجہ سے پارٹی سے دور رہتے ہیں۔ ایسے افراد کے لئے پارٹی میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے گروہ بنتے جارہے ہیں، جو کچھ عرصہ بعد بیگانگی کا شکار ہوکر یا تو مایوس ہو جاتے ہیں، یا سوچ میں یکطرفہ پن (DEVIATION) اور کجرویوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پارٹی سکولنگ کے ذریعے انقلابی شخصیتوں کو تراشنے اور نکھارنے اور ان میں موجود صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ آرام کے بغیر، حد سے زیادہ صعوبتیں کنگلاپن اور لمبے عرصے تک معمول کے کام سے تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم گیری اور شعبہ جاتی تحقیقی کام میں توازن رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ پارٹی کیڈر سے لمبے عرصے تک کام کی توقع اس صورت میں رکھی جاسکتی ہے جب ان کو ان کی استعداد اور طاقت کی

مناسبت سے کام دیا جائے، اور کام لیا جائے۔

پارٹی کیڈر میں چاکنگ، پوسٹرز، جلسے اور جلوس منظم کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے، لیکن وہ انتظامی امور میں بہت پیچھے ہے۔ نئے کام نکالنے اور ان کو پورا کرنے کے لئے جس صلاحیت یا استعداد اور اعتماد کی ضرورت ہے وہ بہت کم ہے۔ عملی زندگی کی مختلف حقیقتوں سے ناواقفیت اور عوامی کلچر و روایات سے بیگانگی موجود ہے۔ عوام سے ان کی اپنی زبان میں ابلاغ کرنے میں ہمارے ساتھی مشکل محسوس کرتے ہیں۔ پارٹی کو عوام میں رچ بس کر کام کرنا چاہیئے۔ خوش فہمی اور مایوسی دونوں جلد ہی اثر دکھاتی ہیں۔

پارٹی ممبروں میں سوسائٹی میں موجود اخلاقی پستیوں کے شواہد کم ملے ہیں۔ رشوت اور بے ایمانی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن جیسے ہی پارٹی تعداد کے اعتبار سے بڑھے گی۔ یہ امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہوگی۔ پارٹی کو اخلاقی پستیوں سے بچاؤ کا مسئلہ درپیش نہیں بلکہ ساتھیوں کو انقلابی عمل اور مثالی نمونہ بننے کی ضرورت ہے۔ سوسائٹی میں قدر و منزلت اور عوام کا اعتماد تب جیتا جائے گا۔ جب ساتھی خود اپنی ذات میں انجمن ہوں گے۔

دوسری کانگریس کے بعد سے پارٹی سکولنگ کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں رہا۔ بعض علاقوں میں ساتھیوں کو ابتدائی مارکسزم پڑھایا گیا۔ لیکن تیسری کانگریس کے سامنے یہ مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ درپیش ہے، کہ پارٹی سکولنگ بطور ادارہ کام کرے۔ اپنے لئے کورسز کا تعین کرے، بنیادی فلسفے کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ اور بین الاقوامی تحریک کے مسائل کو بھی پڑھائے۔ ٹریڈ یونین، طلبا اور سیاسی محاذ پر کام کرنے کے مسائل اور طریقہ کار کے بارے میں (REFRESHER COURSE) تجدیدی کورسز کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الوقت سکولنگ کے لیے مناسب کیڈر کی کمی ہے۔ لیکن اس ادارے کو شروع کرنے سے ہی کیڈر کی کمی دور ہوگی۔

آج تک پارٹی تاریخ اور تحریک کی تاریخ لکھی نہیں جا سکی۔ بہت دفعہ پارٹی ریکارڈ ضائع ہو گیا۔ اور کچھ ریکارڈ رکھنے کی
طرف توجہ بھی نہیں رہی، لہذا پارٹی کی تاریخ میں گمشدہ کڑیاں موجود ہیں۔ اور مستند تحریر میں کافی دشواریاں ہیں۔

دوسری کانگریس کے بعد ۸۳ء تک پرچہ باقاعدگی سے چھپتا رہا ہے۔ لیکن ترسیل اور تقسیم کا بندوبست صحیح نہیں تھا۔ نتیجتاً کیڈر تک پہنچتے پہنچتے سیاسی حالات میں تبدیلی آچکی ہوتی اور یوں پرچہ بے مقصد رہ جاتا۔ ۸۳ء کے بعد چھپائی میں بے قاعدگی شروع ہوئی جو تاحال جاری ہیں۔ پرچہ کسی ایک دو ساتھیوں کی ذمہ داری نہیں۔ اور نہ ہی

ایک دو ساتھیوں کے بس کی بات ہے۔ جس سے گوناگوں قسم کے مفر اثرات مرتب ہوئے ہیں پارٹی پرچہ تعلیم و تربیت، تنظیم اور سیاسی موقف پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تیسری کانگریس کو پرچے کے لئے مناسب انتظام کرنا ہوگا۔ جو آج صرف تنظیمی مستعدی سے ممکن نہیں ہے بلکہ ایک قانونی جریدے کی ضرورت ہے۔ جو ہفت روزہ اور مرحلہ وار روزمرہ کیا جاسکتا ہے۔

پرچے کے علاوہ ترجمے اور نظریاتی و سیاسی مسائل پر مروجہ زبان اور حالات کی مناسبت سے جتنی کتابیں اور رسائل چھپیں گے پارٹی اتنی ہی مستعد اور منظم رہے گی۔ وسیع پیمانے پر تعلیم کے لئے مزدوروں اور کسانوں اور مظلوم عوام کے دیگر حصوں کے مسائل کے حوالے سے سیاست اور نظریہ کی ترویج بڑے پیمانے پر کی جانی چاہئیے۔

دوسری کانگریس کے بعد کانگریس کی سیاسی رپورٹ صرف پچاس کی تعداد میں چھپی تھی۔ اور اس طرح غیر قانونی ہینڈ بلز اور پمفلٹ پورے ملک کے لئے صرف سینکڑوں کی تعداد میں چھپتے تھے۔ تقسیم کے لئے صوبوں اور ضلعوں میں چند کاپیاں

پہنچی تھیں۔ جس سے پراپیگنڈہ کم اور حکومتی مشنری زیادہ چوکس ہو جاتی تھی۔ ایسے حاضری لگانے والے ہینڈ بلز نے بہت سے ساتھی جیلوں میں گئے۔ جبکہ اسیر ساتھیوں سے جیل میں خاطر خواہ رابطہ نہیں رکھا گیا۔

کنٹرول کمیشن پارٹی کا ایک اہم اور بنیادی اور ضروری ادارہ ہے۔ جو اب تک وجود نہیں رکھتا تھا۔ اس ادارے کو پارٹی ممبران کے خلاف تادیبی کاروائی کی جانچ پڑتال اور نگرانی کرنی ہے۔ مختلف صوبوں اور یونٹوں میں یکساں ممبر شپ کے قواعد و ضوابط پر نظر رکھنا ہے اور پارٹی تنظیم میں موجود مثبت اور منفی رجحانات پر نظر رکھ کر سفارشیں مرتب کرنا ہے۔

فنڈز کی وصولیابی مختلف اضلاع اور صوبوں میں باقاعدہ نہیں رہی ہے۔ خصوصاً پارٹی میں تقسیم کے بعد بعض اضلاع سے فنڈز کی وصولی نہیں ہو رہی ہے۔ فنڈز میں بے قاعدگی کا سنگین نوٹس لینا ضروری ہوگا۔ مزید براں آج کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ماہوار فنڈز کے علاوہ وسائل بڑھانے پر توجہ کی ضرورت ہے۔

پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے دوسرے اہم اداروں کے فقدان کی طرح انٹرنیشنل ڈیپارٹمنٹ بھی ہر چند کہیں ہے کہ نہیں والی صورت حال کا شکار رہا اور یہ بھی ایک باقاعدہ ادارے کی شکل میں وجود میں نہیں آیا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد ملک سے باہر چند ساتھیوں کی موجودگی کی وجہ سے پارٹی کو بین الاقوامی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوا اور بہت سے دیگر

ممالک کی پارٹیوں سے دو طرفہ تعلقات استوار ہوئے جن میں سوشلسٹ ممالک کی پارٹیاں اور پڑوسی ممالک کی پارٹیاں قابل ذکر ہیں۔ اس طرح پارٹی کے وفود مزدور طبقے کی پارٹیوں کی مختلف کانگریسوں اور دیگر بین الاقوامی اور علاقائی کانفرنسوں اور میٹنگوں میں شریک ہوئے جس کی بدولت پارٹی کو کسی حد تک بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے پلیٹ فارم پر اپنا نکتہ نظر پیش کرنے اور ساتھ ہی بین الاقوامی کمیونسٹ اور مزدور تحریک کے تجربات سے سیکھنے کا موقع ملا۔ اب ایک باقاعدہ انٹرنیشنل ڈیپارٹمنٹ کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۸۲ء میں پارٹی کی خارجہ کمیٹی بنی جس نے بیرون ملک پارٹی کی تنظیم کاری کا کام سنبھالا اور مشرقی و مغربی یورپ میں پارٹی کی شاخیں قائم کرنے میں کردار ادا کیا۔ پارٹی کے اندر بحران اور رابطوں میں موجود مشکلات کی وجہ سے خارجہ کمیٹی کا کام بھی متاثر ہوا ہے۔

فرنٹس اور متحدہ محاذ

دوسری کانگریس کے بعد سیاسی محاذ پر پانچ دفعہ لمبی مدّت کی ایک پلیٹ فارم والی پارٹی بدلی گئی جس کے نتیجے میں پارٹی پر سیاسی خانہ بدوشوں کی پارٹی کا نام پڑ گیا۔ بار بار پارٹیاں بدلنے کی بنیادی وجہ متحدہ محاذ کی مختلف شکلوں کے مابین فرق کا غیر واضح تصور، سوچ، عوامی قوت بنے بغیر مصنوعی طریقوں سے دوسروں پر مجرد پرولتاری مینڈیٹ نافذ کرانا۔ اور کسی ایسی پارٹی کے مقاصد کا پلان اور دائرہ کار کا نہ ہونا تھا۔ ان موضوعی وجوہات کے علاوہ خطے اور ملک میں آنے والی ڈرامائی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہمارے اتحادیوں کی سیاست اور ترجیحات میں تیزی سے اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ اگرچہ اس عمل سے بعض علاقوں میں سامراج دشمن قوتوں کو یکجا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ عوام کے وسیع حلقوں میں قومی اور سامراج دشمن رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن بعض دوسرے علاقوں میں اس کے برعکس عمل ہوا ہے۔ مزید براں اس طرح کے متحدہ محاذوں میں ڈبل ڈسپلن سے پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔

ٹریڈ یونین محاذ پر پارٹی مسلسل کئی کمزوریوں کا شکار رہی ہے جن میں ٹریڈ یونین محاذ پر تنگ نظری، تعصب اور سازشی انداز میں ٹریڈ یونین کارکنوں کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی کی طرف سے ٹریڈ یونین محاذ پر کام کرنے والے رہنما اور کارکن عمومی طور پر دیگر ٹریڈ یونین لیڈروں کی نفرت اور عتاب کا شکار رہے ہیں۔ پارٹی کی عمومی سیاسی لائن اور ٹریڈ یونین محاذ کی اپنی معروضی ضروریات

میں بعد ہونے کی وجہ سے اکثر پارٹی اس محاذ پر طفلانہ مہم جوئی اور موقع پرستی کا شکار رہی ہے۔ درج ذیل عمومی رجحانات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) ٹریڈ یونین محاذ کو سیاسی پارٹی یا انقلابی تنظیم کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش۔

(۲) معروضی صورتحال کا تجزیہ کیئے بغیر ٹریڈ یونین محاذ پر خفیہ پارٹی کا فیصلہ لاگو کرنا۔

(۳) ٹریڈ یونین محاذ کو مزدور طبقے کا وسیع تر محاذ بنانے کی بجائے اپنے ہی ساتھیوں پر مشتمل تنظیم بنانے کا رجحان خواہ ان کا حلقہ اثر نہ ہونے کے برابر ہو۔

(۴) مزدور طبقہ میں ہونے والی ہر خود رو یا دیگر جدوجہد کو نہایت بھدے انداز میں اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش۔

(۵) اتحاد و متحدہ محاذ سے مسلسل اجتناب اور اپنی ہی تنظیم کے ذریعے تمام کام کرنے کی کوشش۔

(۶) قانونی وغیرہ قانونی جدوجہد کے فرق کو نہ سمجھنا اور ان کو مربوط کرتے ہوئے جدوجہد کو آگے بڑھانے کے فن سے مکمل طور پر نابلد ہونا۔

(۷) کسی مہم جوئی کی وجہ سے نقصان ہوئے تو پھر دوسری انتہا یعنی مکمل طور پر موقع پرستی کی سطح پر گر جاتا اور سادہ ٹریڈ یونین کا پرچار۔

ان غلط رجحانات کی وجہ سے ٹریڈ یونین محاذ پر پارٹی کو ہمیشہ نقصانات اٹھانے پڑے اور پارٹی کا یہ محاذ تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا۔ البتہ جب ٹریڈ یونین میں کام کرنے والے باشعور عناصر پارٹی میں شامل ہوئے تو انہوں نے ان تمام غلط رجحانات کے خلاف مستقل مزاجی سے جدوجہد کی اور اتحاد و متحدہ محاذ اور کم از کم پروگرام پر زیادہ تنظیموں کو ملا کر جدوجہد کرنے کی حکمت عملی اور طریقہ کار کی وجہ سے اس محاذ میں نہ صرف وسعت پیدا ہوئی بلکہ معروضی صورت حال کی مطابقت میں جدوجہد کی حکمت عملی اور عملی پروگرام و جدوجہد کی قابل عمل شکلیں اپنانے کی وجہ سے مزدوروں میں پارٹی کا ٹریڈ یونین محاذ مقبول ہوا اور پارٹی کی طرف سے مزدوروں میں موجود قیادت کی ساکھ بھی بہتر ہوئی اور آج پارٹی کے زیر اثر ایک کافی بڑا ٹریڈ یونین محاذ موجود ہے جس کو نہ تو دیگر تنظیمیں اور نہ ہی حکومت نظر انداز کر سکتی ہے۔

طلباء محاذ پر کام کرنے کے سلسلے میں تمام مسائل کی طرف سنجیدہ رویہ اپنانا ہوگا۔ اس محاذ کی بنیادیں عام طلباء کے ہجوم کے بیچ میں سے تعمیر کرنی ہونگیں۔ جس کے لئے طلباء محاذ کے تقاضوں اور اس کی ضرورتوں کو سمجھتے ہوئے اس کا طریقہ کار خود وضع کرنے

کی حوصلہ افزائی کے علاوہ طلباء محاذ پر موجود کیڈرز کی نظریاتی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ طلباء محاذ کے کام کو دو حوالوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اول عام طلباء میں اس کا وجود اور اثرو نفوذ اور دوئم ترقی پسند طلباء تحریک میں اس کا کردار اور دوسری ترقی پسند قوم پرست اور جمہوریت پسند طلباء تنظیموں سے اس کے رشتے اور مقام۔ ان دونوں پہلوؤں کے حصول کے لئے لازمی ہے کہ اس محاذ کو زیادہ جمہوری انداز میں اپنے فیصلے کرنے کا زیادہ سے زیادہ اختیار دیا جائے اور اس محاذ پر موجود انتہا پسندانہ رجحانات کی باقیات کو ختم کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے۔

پچھلے چند سالوں میں خواتین کے خلاف امتیازی قوانین کے اجراء سے ان میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے جسے تنظیمی طور پر یکجا کرنے کی ضرورت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ دیگر محاذوں کی طرح ہمارے خواتین محاذ میں بھی تنگ نظری کا رجحان غالب رہا ہے اور خواتین کی انجمن کو پارٹی کے اپنے فرائض سے گڈ مڈ کرنے کے نتیجے میں یہ تنظیم سکڑ کر رہ گئی ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ خواتین پر بہیمانہ استحصال کی ہر شکل کے خلاف ایک وسیع تر تنظیم تشکیل دی جائے جو عورتوں کی بڑی تعداد کو جو ابھی تک اس تحریک سے لاتعلق ہیں اپنے اندر سمو سکے۔

تحریک کے اس مرحلے پر دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں، وکلاء اور دیگر پیشہ ور حضرات کے ریاستی ڈھانچے کے مختلف اداروں میں سمو جانے کے رجحان کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسی فعال، متحرک اور تخلیقی تنظیموں کے قیام کی ضرورت ہے جو اس تحریک میں ان کی شمولیت کو ممکن بنائیں۔

مستقبل کی جانب

ایک طویل عرصے تک پارٹی میں عقیدہ پرستانہ، اپنی سماجی حقیقتوں سے کٹا ہوا اور عوام کے شعور کی سطح کے بارے میں انجان رجحان کے غالب رہنے کی وجہ سے پارٹی ایک زندہ متحرک سیاسی تنظیم بننے کی بجائے مجہول بے حرکت تنظیم بن گئی تھی۔ پارٹی ایک ایسی روایت کے تحت کام کرتی رہی جو شکست خوردگی کی روایت تھی اور جو پرولتاریہ کی پارٹی کی آزاد حیثیت سے نیچے گر کر مشاورتی سطح پر بہت وسیع پارٹی میں جا کر کام کرنے کی روایت تھی۔ تنظیم برائے سیاست کی بجائے تنظیم برائے تنظیم کا رجحان مضبوط ہوا۔ تنظیم کا طریقہ کار یہاں کی دھرتی کی نشونما سے نہیں پھوٹا بلکہ وہ معاشرہ کے لئے ہمیشہ باہر کی کوئی قوت رہی ہے۔ عوام کے تنظیم کے جو اپنے طریقے

ہیں، ہم نے ان سے کچھ نہیں سیکھا۔ عوام سے ہمارا زندہ رشتہ نہیں بنا۔
اس حالت میں سے پارٹی کو یکسر نکالنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل خطوط پر سوچ اور عمل کی طرف توجہ دینی چاہیے۔
(ا) پارٹی کو حقیقی معنوں میں انقلابی پرولتاریہ کی عوامی پارٹی بننا ہے۔ جس کی جڑیں اور طاقت پرولتاریہ اور محنت کش عوام میں ہو اور جو ان کے فوری اور دوررس مفادات کے نگہبان ہو۔ پاکستان کی مختلف قوموں کے مخصوص تاریخی اور تہذیبی حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ مزدور طبقہ کی انقلابی تحریک نہ صرف مزدور طبقے اور محنت کش عوام کے معاشی سماجی اور سیاسی مفادات کے حصول کو اپنا مطمع نظر بنائے بلکہ اس کی جڑیں ان اقوام کی تاریخ، ثقافت، ادب، روحانی زندگی اور مذہبی روایات میں پیوست ہونی چاہیے۔
(۲) پارٹی ایسی حرکی قوت اور تنظیم بنے جو متشدد آمرانہ اور جمہوری، مختلف سیاسی ادوار اور حالات کا نہ صرف مقابلہ کرے، اپنے آپ کو برقرار رکھے بلکہ عوام کی راہنمائی کرتے ہوئے مضبوط سے مضبوط تر بنے۔ ضرورت پڑنے پر کھلا اور زیر زمین رہ کر کام کرنے کے قابل ہو۔ مختلف علاقوں اور قوموں کے درمیان سماجی نفسیاتی، سیاسی اور شعوری فرق کو مربوط بھی کرے اور وہاں کے عوام کو خصوصی مسائل پر متحرک بھی کرے۔
(۳) ملک کے مارکسی گروہوں، پارٹیوں اور افراد کو قریب لا کر ایک تنظیم میں منظم کیا جانا ہے تاکہ تحریک کو اتحاد اور قوت کے لحاظ سے نئی سطح پر لایا جاسکے۔

ساتھیو!

آگے بڑھو
نئی قوت کے ساتھ
نئے عزم کے ساتھ
بہتر نتائج کے لئے۔

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَــنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بـہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻُو تـہ اُهو ڪُـوڙو آهي. نـہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪـڏهن ڪـو اهڙي ڪوشش ڪـري ٿو تـہ پَڪَ ڄاڻُو تـہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيـرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرنـدڙ ۽ پڙهندڙ، سُـست ۽ پڙهنـدڙ يـا وِڙهنـدڙ ۽ پڙهنـدڙ بـہ ٿـي سـگهن ٿـا. ٻيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نـہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تـہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪـار سَـهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پـر ممڪـن آهـي تـہ ڪـي ڪـم اُجرتـي بنيـادن تـي بـہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مـدد ڪَــرڻ جــي اُصــولَ هيــٺ ڏي وَٺُ ڪنــدا ۽ غيرتجــارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيٽـائِيز digitize ڪـرڻ جي عَمـلَ مـان ڪـو بـہ مـالي فائدو يا نفعو حاصـل ڪـرڻ جي ڪـوشش نـہ ڪـئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪـرڻ کان پـو ٻيـو اهـم مرحلو وِرهـائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪـم ڪـرڻ وارن مـان جيڪـڏهن ڪـو پيسا ڪمـائي سگهي ٿو تـہ پلي ڪمـائي، رُڳـو پَنَـن سان اُن جو ڪـو بہ لاڳاپو نـہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پڄاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڻڄاڻائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڑهڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻجاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙهَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَڙهَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽلر گهرج necessity unavoidable سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)